سیرت پاک آفتاب ولایت، قدوۃ الاولیاء، حامی بیکساں واقف رموز شریعت وطریقت

حضرت

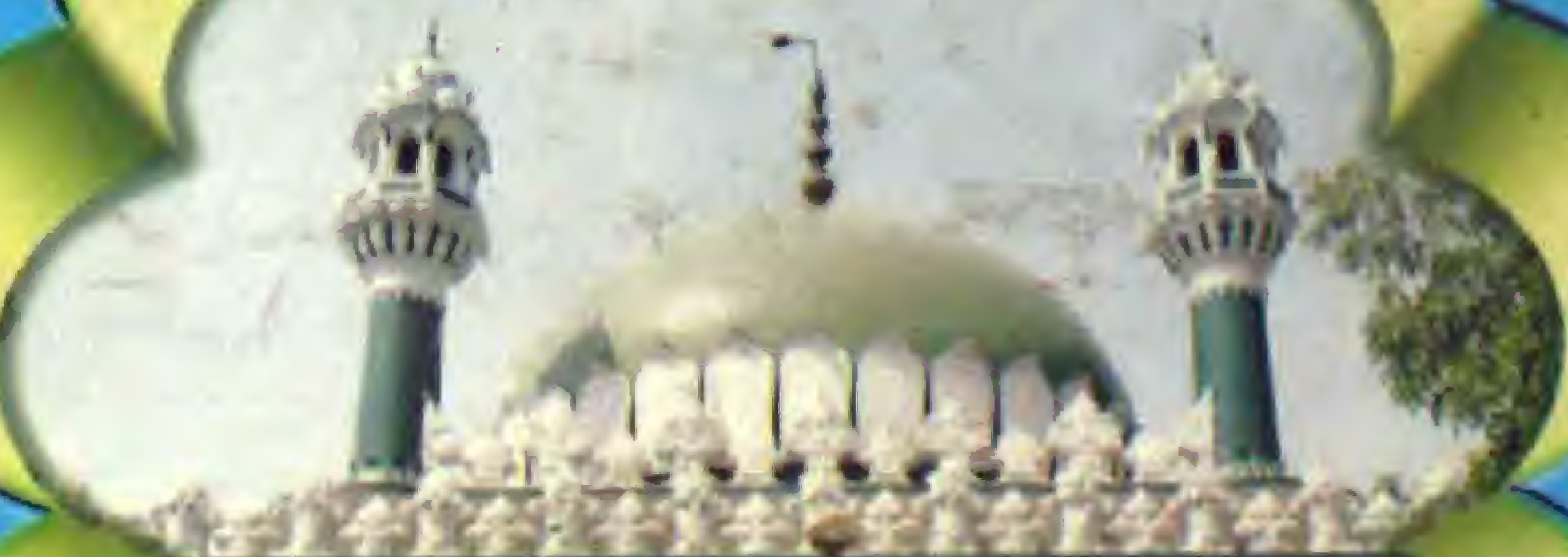
# شاہ کبیر الدین

المعروف

حضرت

# شاہ دولہ دریائی

رحمۃ اللہ علیہ



حضرت پیر سید

ارتضیٰ علی کرمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرت پاک

# حضرت شاہ دولہ رحمتہ اللہ علیہ

# سیرت پاک

آفتاب ولایت، قدوۃ الاولیاء، حامی بیکساں،
واقفِ رموزِ شریعت وطریقت
حضرت سید کبیر الدین

المعروف

# حضرت شاہ دولہ دریائی رحمۃ اللہ علیہ

پیر سید ارتضٰی علی کرمانی

عظیم اینڈ سنز پبلشرز
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، فون ۷۲۳۱۸۰۶

حاجی محمد عظیم بٹ عظیمی قادری نے
صابر پریس سے چھپوا کر 2006 میں
اُردو بازار لاہور میں شائع کی
قیمت 90 روپے
بیرون ملک 10 ڈالر

# حُسن ترتیب

انتساب بنام!

**محترم المقام**

فخر سادات، نورِ سادات، زینتِ سادات

صاحبزادہ حافظ سید محمد فیصل عثمان نوری

مدظلہ العالی دامت برکاتہم قدسیہ

آستانہ عالیہ نوریہ معصومیہ، چک سادہ شریف، گجرات

# عرض ناشر

عزیزی قارئین کرام!

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔

الحمد للہ رب العالمین ادارہ آپکی خدمتِ عالیہ میں اولیائے کرام رحمتہ اللہ علیھم اجمعین کی سیرت ہائے مقدسہ کے سلسلہ کی اور سیرت پاک پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ بلاشبہ اولیاء کرام کی زندگیاں ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب ہم ان سے اپنی زندگیوں میں روشنی حاصل کرنے کی کوششیں کریں صرف کہہ دینے ہی سے یہ کام نہیں ہوتا۔

ادارہ محض اسی جذبہ کی خاطر اولیائے کرام کی سیرت ہائے مقدسہ پر کامل توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے کہ اس سے ہمارے نوجوانوں کی زندگی گزارنے کے لئے اچھی راہ حاصل ہوئے۔ اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

خیر اندیش

حاجی محمد عظیم بٹ عظیمی قادری

# من گونم

**نحمد و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ**

**با اللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔**

بندہ حقیر فقیر، پر تقصیر عرض کرتا ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ مفکر اسلام ممتاز محقق اور عالم با عمل حضرت پیر سید ارتضیٰ علی کرمانی وارثی شاہ صاحب حضرت شاہ دولہ دریائی گجراتیؒ کی سیرت مقدسہ پر کتاب تالیف فرما رہے ہیں۔ تو میں بہت ہی خوش ہوا۔ مجھے خوشی اِس بات کی تھی کہ قبلہ شاہ صاحب گذشتہ دو تین سال سے اس بات کا ارادہ فرما رہے تھے مگر بات بن نہیں رہی تھی ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے قبلہ شاہ صاحب کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں نے اُنہیں اس وقت بھی دیکھا ہے کہ جب آپ بالکل جوان تھے اور باڈی بلڈنگ کیا کرتے تھے۔

میری شناسائی مبالغہ لا تعداد بزرگوں کے ساتھ ہے۔ مگر قول و فعل کی پاسداری جس قدر میں نے قبلہ شاہ صاحب میں دیکھی وہ مجھے کم ہی لوگوں میں دکھائی دی ہے۔ اگر ایک طرف حضرت پیر صاحب اولیائے کرام کے ایک عظیم سیرت نگار ہیں تو دوسری طرف آپ ایک عظیم روحانی شخصیت کے بھی مالک ہیں

اگر آپ کو سیف اللسان کہا جائے تو قطعاً بیجا نہ ہوگا میں خود اس کا گواہ ہوں اور معترف ہوں۔ شاہ صاحب نے سیرت نگاری اولیائے کرام کی جو اپنے قلم سے کی ہے وہ صرف انہی کا خاصہ کہی جا سکتی ہے۔ اِس دور میں جبکہ چہار جانب مذہبی منافرت اور شدت پسندی کا دور دورہ ہے۔ آپ نے اپنی کتابوں میں بڑی ہی سختی سے اِس بات کو رد کیا ہے۔ آپ نے انہی کتابوں جو کہ زیادہ تر اولیاء کرام کی سیرتوں پر ہی مشتمل ہے صرف اور صرف اپنی بزرگوں کی ذاتِ اقدس کو موضوع سخن بنایا ہے۔

جس طرح عام طور پر لوگ آپ کی تحریر کردہ کتابوں کا مطالعہ کر کے اُن سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اِن سے مل کر بھی بندہ ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ پہلے پہل آپ کی کھری باتیں لوگوں کو پسند نہیں آتیں۔ ان کو پہلی مرتبہ ملنے والوں کو اچھی ہی نہیں لگتیں۔ مگر وہی لوگ آپ کے بہت جلد ہی دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی فطرت کا خاصہ یہ ہے کہ آپ کوئی بھی بات لگی لپٹی بغیر کہہ دیتے ہیں آپ کی باتیں زیادہ تر نصیحت آموز ہوتی ہیں۔ اور آپ کسی کی بھی غلط بات کو قطعاً براداشت نہیں کرتے۔

میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ ذرا کسی نے بے ادبی یا شان رسالت میں نادانستگی سے ہی کوئی بات کر دی تو پھر قبلہ شاہ صاحب کا جلال دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ ساتھ معروف بزرگوں کے ارشادات عالیہ کے حوالوں سے اِس بندے کو سمجھاتے ہیں اور ساتھ ساتھ آخرت کا خوف بھی یاد دلاتے ہیں۔

مجھے نہیں یاد کہ کسی شخص نے یہ بھی آپ کی کسی بات سے انکار کیا ہو میں نے بھی دیکھا ہے کہ آپ کے تعلق میں لاتعداد لوگ ہیں اور پیران عظام اور علمائے کرام اور اِس کے علاوہ ممتاز نعت خوان حضرت اور بڑے بڑے لوگ ہیں۔ میں نے دیکھا ہے سبھی قبلہ شاہ صاحب کی یکساں عزت وتکریم کرتے ہیں۔ ایک بات بڑی حیران کن ہے کہ قبلہ شاہ صاحب کسی کے پاس بھی جانے سے احتراض فرماتے ہیں۔ اگر آپ کہیں اکثر اور متواتر جاتے ہیں تو وہ دربار حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ اور ہمارے شیخ مخدوم اہلسنت فخر اہلسنت پیرومرشد سید محمد معصوم شاہ گیلانی قادری نوری رحمتہ اللہ علیہ کا فیضان اور اہل سنت کا پرچار جہاں سے ہوا وہ نوری کتب خانہ نزد دربار داتا صاحب ہے۔ آپ ہر جمعرات کی حاضری کو کبھی ملتوی نہیں فرماتے۔ جب لوگ مجھے کہتے ہیں کہ شاہ صاحب ہمارے پاس سے گذر کر تمہارے کتب خانہ پر آجاتے ہیں اور ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرتے تو مجھے اس بات سے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔

میں اگرچہ بہت نکما سا بندہ ہوں مگر میں صدق دِل سے اللہ کریم غفور الرحیم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قبلہ پیر سید ارتضی علی کرمانی وارثی شاہ کی فضیلتوں میں ترقی عطا فرمائے اور اُن کی تالیفات کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول وممنون فرمائے۔ آمین۔

(اللہ کرے ذوق سخن اور زیادہ)

29 شوال المکرم 1426ھ
بروز جمعتہ المبارک 2 دسمبر 2005ء
بمقام نوری کتب خانہ دربار
مارکیٹ لاہور

از حقیر پُر تقصیر
صوفی محمد ظفر اقبال نوری
خادم آستانہ عالیہ نوریہ چک سادہ
شریف گجرات

# میری عرض

الحمد للہ رب العالمین الصلوٰۃ والسلام علیک سید المرسلین وخاتم النبین اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بلاشبہ تمام مخلوقات کا مالک و خالق اور تمام کائناتوں کا مالک و خالق اللہ رب العزت ہی ہے۔ اسی نے پیدا فرمایا ہے جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے اور جو کچھ ہماری نظروں سے پنہاں ہے۔ وہی ہے جو ہمارے دلوں کی تمام ترکیفیات کو جانتا ہے اور وہی ہے جو ہمیں بھلائی کی راہ دکھلاتا ہے۔

اللہ رب کریم عزوجل کی بے پایاں عنایاتِ کریمانہ میں سے ایک عنایت ہم پر یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں پیدا فرمایا اور ہمیں دین متین کی سمجھ عطا فرمائی۔

بے حد و بے حساب درود و سلام اللہ کریم عزوجل کے حبیبِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بیکس پناہ پر کہ جو ہادیء برحق ہیں۔ آپ کی بعثتِ اقدس اس دور میں ہوئی جو کہ تاریخِ انسانیت کا تاریک ترین اور بدترین دور کہلاتا تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت صادقہ نے دنیا میں تربیت اس انداز میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی کہ ان کی زبان اقدس سے نکلنے والے ہر ہر لفظ کو محفوظ کیا جانے لگا اور ان پر عمل کیا جانے لگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو دینِ متین کی تبلیغ وترویج کا کام اصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سنبھالا اور خوب سنبھالا۔ اصحابہ کبار

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد اس کام کی ذمہ داری بحکم الٰہی اولیائے کرام رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سنبھالی۔

زیرِنظر کتاب ایک بہت ہی مشہور و معروف ولی کامل یعنی حضرت سید کبیر الدین شاہ صاحب المعروف شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کی سیرت پاک پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی ترویج و ترقی اللہ رب العزت کے حکم و فضل اور اولیائے عظام کی انتھک کاوشوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔

ولی کے معنی ہوتے ہیں قرب کے اور ولایت کے لفظ دراصل ولی سے ہی مشتق ہوتا ہے۔ بزرگوں کا ارشادِ گرامی ہے کہ ولایت کی اقسام دو ہوتی ہیں۔ ایک تو ہوتی ولایتِ عامہ یعنی جس میں تمام مومنین ہی شامل تصور کئے جاتے ہیں۔ جبکہ ولایتِ خاصہ وہ ہوتی ہے جو کہ اہل سلوک کے برگزیدہ بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر جو ولی یا پھر اولیائے کرام کا جو نام لیا جاتا ہے وہ دراصل ولایتِ خاصہ کے حاملین بزرگوں کا ہی ہوتا ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراھیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ایک عقیدت مند سے فرمایا کہ "کیا تم ولی اللہ بننا چاہتے ہو۔" تو اس نے عرض کیا "جی ہاں! کیوں نہیں میں یہ مرتبہ ضرور حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔ یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا "تو پھر ایسا کرو کہ دنیا اور آخرت کی قطعاً خواہش نہ کرو۔ کیونکہ ان کی خواہش سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعراض ہوگا۔ اس کے بعد خود کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی دوستی کے لئے بالکل فارغ کرو۔ یعنی دنیا اور آخرت کا خیال بالکل بھی اپنے دل میں مت لاؤ بلکہ اپنے دل کی تمام تر توجہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول کراو۔ پس جب یہ اوصاف تم میں پیدا ہو جائیں تو اس وقت تم ولی ہو جاؤ گے۔"

ولی اللہ کی شرائط جو بزرگوں نے بتلائی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ولی وہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ ہو۔ جس شخص پر شرع کی طرف سے اعتراض موجود ہو وہ اس شرط سے بالکل معذور تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ عرض ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک ولی اللہ کا شہرہ سنا۔ آپ بہت دور دراز کا

سفر طے کر کے اس ولی کی مسجد میں پہنچے۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد وہ صاحب اپنے حجرہ سے باہر نکلے آپ احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ معاً آپ نے دیکھا کہ اس شخص نے قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوک پھینکا۔ حضرت بایزید بسطام رحمتہ اللہ علیہ اسی وقت مسجد سے باہر نکل آئے اور اس شخص سے ملاقات نہیں کی۔ مسجد سے باہر تشریف لا کر آپ نے فرمایا "جب یہ شخص آدابِ شریعت سے اس قدر بے خوف ہے تو پھر بھلا یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار کا امین کیونکر ہو سکتا ہے۔"

اسی طرح ایک بہت مشہور عالم جب حضرت ابوسعید ابو الخیر رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے آیا تو اس نے مسجد میں داخل ہوتے وقت اپنا بایاں پاؤں پہلے اندر رکھا۔ آپ نے صحن میں سے ہی پکار کر فرمایا کہ تم واپس جا سکتے ہو۔ جس شخص کو مسجد کے آداب کا ہی علم نہیں وہ بھلا عالمِ دین کیسے ہو سکتا ہے۔

ان دونوں واقعات کو تحریر کرنے کا مقصد اس فقیر کے پیش نظر یہ تھا کہ آداب شریعت کا علم ہونا ہر مسلمان عورت مرد پر لازم ہے۔ اگر کسی کو علم ہی نہیں ہو گا تو پھر وہ کسی کو پرکھے گا کیسے اور کسی کو نصیحت کیسے کرے گا۔ ہاں مگر جب اس کو علم ہو گا تو وہ نہایت پیار و محبت سے اپنے قریبی لوگوں کی اصلاح بھی کرے گا اور خود بھی ثواب حاصل کرے گا۔ اسی طرح ہمارے بزرگوں نے عملی تربیت کے ذریعہ اپنے پاس آنے والوں کی زندگیاں عین اسلامی ماحول میں ڈھال دی تھیں۔

یہ فقیر عرض کرتا ہے کہ آپ جب کسی کو بھی یہ کہہ کر یا اس بات کی نشاندھی کر کے کسی کو نصیحت کریں گے کہ یہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہے تو پھر کوئی بھی آپ کی بات کا ہرگز بُرا نہیں منائے گا بلکہ وہ آپ کا شکر گزار ہو گا۔ یہ اس فقیر کا ایک عرصہ سے تجربہ ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ نصیحت کرنے سے پہلے آپ کے اپنے تمام تر معمولات کو سنت اور شریعت کا پابند ہونا چاہیے۔ تاکہ کوئی بھی شخص آپ پر انگلی نہ اٹھا سکے کہ یہ صاحب ہمیں تو سمجھا رہے ہیں مگر خود تو عمل نہیں کر رہے۔

اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں کے بچے دین متین اور مذہبی

تعلیم وتربیت سے تقریباً بے بہرہ ہوتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں۔ یہ بڑی ہی افسوسناک بات ہے ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ ہرگز نہ تھا۔ اب ہوتا یوں ہے کہ جب ایک پیر صاحب کا وصال ہو جاتا ہے تو انکے صاحبزادے کو ان کی جانشینی اور سجادگی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ ہمیں اپنے بزرگوں میں نہیں دکھائی دیتا۔

عام طور پر ہمیں بزرگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مناصب جلیلہ انہی کوملا کرتے تھے جو ان کے اہل ہوتے تھے اور جو بلند روحانی درجات کے حامل ہوتے تھے۔ یہ مناصب جلیلہ بالکل بھی موروثی نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ ان کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ریاضت، عبادت، مجاہدات اور مشاہدات کے لئے۔ اب جس کی اپنی تربیت نہیں ہوئی وہ بھلا کس طرح اپنے پاس آنے والوں کی تربیت کرے گا۔

یہ فقیر بڑے فخر سے کہہ سکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی قائم کردہ خانقاہیں بلا مبالغہ آج کے دور کی عظیم ترین یونیورسٹیوں اور کالجوں سے بدرجہا افضل و اعلیٰ تھیں۔ ان میں سے لاکھوں کی تعداد میں بڑی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں اور اسلام کا نام دنیا میں روشن کیا۔

اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں راہِ ہدایت نصیب فرمائے۔ اے اللہ کریم اپنے حبیب پاک کے صدقہ میں میرے گناہوں کی بخش دے۔ میرے دوستوں اور عزیزوں کو معاف فرما دے۔ میرے بزرگوں خصوصاً میرے والدین کریمین کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرما۔ حضرت قبلہ حاجی محمد عظیم بٹ صاحب عظیمی صاحب کو دین و دنیا کی خیر و برکتیں عطا فرما اور ان کے اہل وعیال کی خیر فرما۔ آمین یارب العالمین۔

ربیع الاول 1426ھ
اپریل 2005ء

از خاکپائے سگِ سگان کوئے مدینہ
سید ارتضیٰ علی کرمانی عفی عنہ
چاہ میراں لاہور 0300-4980245

# حضرت شاہ دولہ رحمتہ اللہ علیہ

**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیمO**

حضرت شاہ دولہ گجراتی علیہ الرحمتہ پوری دنیا میں اپنی شہرت کی وجہ سے واحد ولی کامل خطۂ پنجاب میں گزرے ہیں۔ آپ کی شہرت آپکی روحانی سربلندی اور عظمتوں کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کے مزارِ اقدس پر لوگ اپنے بچوں کو بھی بطور چڑھاوا چھوڑ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں آئندہ صفحات میں گفتگو ہوگی۔ مگر بات حیرت انگیز ضرور ہے کہ دنیا میں کبھی بھی اور کہیں بھی یہ طریقہ سننے میں نہیں آیا ہے کہ لوگ اپنے جگر پاروں کو اپنے سے یوں ہنسی خوشی جدا کر دیں۔

اس میں بھی قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ایسا عمل بالکل بھی زور زبردستی سے نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو یوں کسی کو دے دے۔ ہاں یہ بھی بالکل سچ ہے کہ کسی کی خاطر بندہ اپنی جان ضرور قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مگر اپنی اولاد کو وہ ضرور بچانا چاہتا ہے۔

## ولادت با سعادت

حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ کی شخصیت ایسی ہستی ہے کہ جیسے آپ اسرارِ

عالم کے شہنشاہ تھے یعنی تا حال آپ کا صرف نام ہی ہے جو کہ بلندیوں و رفعتوں کو چھوتا چلا جا رہا ہے مگر آپ کے حالات اور آپ کے دور کے واقعات صیغہ راز میں پنہاں دکھائی دیتے ہیں۔

آپ کی ولادت با سعادت بھی تاریخی اوراق میں کسی سند کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ احوال العارفین میں رقم ہے

"ولادت با سعادت قریباً 989ھ میں جناب عبدالرحیم لودھی کے ہاں ہوئی۔ جو کہ شہنشاہ ہند سلطان بہلول خان لودھی کے خاندان سے تھے اور سلطان ابراھیم کے پوتے تھے۔ آپ کی والدہ صاحبہ بی بی نعمت خاتون بنت جناب غازی خان بن سلطان سارنگ سانگھڑ تھیں۔ سلطان سارنگ نے خواص خان باغی کو پناہ دی تھی۔

سلطان سلیم خان بن سلطان شیر شاہ سوری متوفی 960ھ/1553ء نے حملہ کیا۔ رہتاس کے مقام پر لڑائی ہوئی جس میں سلطان سارنگ خان ہلاک ہو گیا اور آپ کے نانا اور والدہ کو قیدی بنا لیا گیا۔

شہنشاہ ہند ہمایوں دوبارہ تخت دھلی پر 963ھ بمطابق 1555ھ میں قابض ہوا تو اس نے اس پاکدامن خاتون کا نکاح اپنے ایک سپاہی یا شاہی داروغہ جناب عبدالرحیم خان لودھی کے ساتھ کر دیا جو کہ افتادِ زمانہ کی وجہ سے شاہی ملازمت میں تھے۔

جس کے بعد حضرت کبیر الدین شاہ دولہ گجراتی رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔

آپ کی ولادت کے اسی برس آپ کے والدِ بزرگوار انتقال کر گئے۔ چنانچہ آپ کی والدہ ماجدہ واپس رہتاس تشریف لے گئیں۔ چونکہ قید کے زمانہ میں وہ بالکل ہی نوعمر تھیں۔ چنانچہ وطن کے لوگوں نے انہیں پہچانا ہی نہیں۔

آپ کی والدہ صاحبہ نہایت کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزارنے لگیں۔ یعنی کوئی بھی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ ایک نزدیکی گاؤں سیلہ اور کالا نامی میں چکی پیس کر اور لوگوں کی خدمت گزاری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالتی رہیں۔

انہی مصائب و الام میں پانچ سے نو برس تک یہ عارفہ گذار کر اپنے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس کے بعد آپ کا کوئی بھی پرسانِ حال نہ رہا۔ آپ راہ گیروں اور دوسرے لوگوں سے بھیک مانگ کر گزارا کرنے لگے۔"

حضرت شاہ دولہ دریائی گجراتی نامی کتاب کے صفحہ نمبر 143 پر جناب ریاض مفتی صاحب نے آپ کے نام اور شخصیت پر یوں تحریر فرمایا ہے۔

شاہدولہ گجراتی (کاٹھیاواڑی) کا نام سید کبیر الدین ابن سید سعید موسیٰ حنبلی بغدادی ہے۔ جائے پیدائش بغداد اور سنِ پیدائش ۵۰۰ھ (تقریباً) ان کے والد پیر بغدادی شیخ محی الدین ابو محمد سید عبدالقادر جیلانیؒ کے خاص دوست تھے

۔شاہدولہؒ کو بھی شیخ جیلانیؒ سے ارادت تھی۔

شیخ اپنی کتاب کرتبہ الوحدت میں لکھتے ہیں:

میں نے بتاریخ انیسویں ماہ رجب ۵۲۱ھ بروز پنج شنبہ بعد نماز مغرب سید کبیر الدین شاہدولہ حضرت سید سعید موسیٰ حنبلیؒ دوست عمومی حقیقی اپنے کو بیعت توبہ سے مشرف کر کے تعلیمات کیفیات باطنی سے بہر مند کیا۔اور ترقی کیفیت باطنی میں متوجہ کر دیا۔''

اس واقعہ کی تصدیق شاہدولہؒ صاحب نے اپنی کتاب تحفتہ الارواح میں فرمائی:

'میں بائیس سال کی عمر میں بتاریخ ۱۹ ماہ رجب ۵۲۱ھ بروز پنج شنبہ بعد نماز مغرب بیعت توبہ سے حضرت قطب ربانی غوث صمدانی شیخ محی الدین ابو محمد سید عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی کریم الطرفین الحسنی والحسینی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مشرف ہوا۔اور تعلیمات کیفیات باطن سے بہرہ مند ہو کر ترقی باطن کی طرف مصروف ہو گیا۔''

ستائیس سال بعد شیخ کی کامل توجہ مرید خاص کی طرف ہوئی۔بحوالہ کرتبہ الوحدت نو ماہ ذی قعد ۵۴۸ھ بروز دوشنبہ بعد عصر محفل عام سامنے بٹھلا کر بیعت امامت و ارشاد سے مشرف کیا۔کلاہ جو اپنے شیخ حضرت ابو سعید مبارک ابن علی مخذومی سے ملی تھی اور آپ تک سلسلہ بہ سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہ سے پہنچی تھی ۔اپنے ہاتھ شاہ دولہؒ کے سر پر اڑھائی اور عمامہ اپنے ہاتھ سے باندھ کر خرقہ پہنا دیا ۔اور خطاب قطب الاسرار حبیب کے ساتھ سند خلافت دی۔

اس واقعہ کی تصدیق تحفتہ الارواح اسرار غوث اکبر الکبیر من تصنیف سید

کبیر الدین شاہ دولہؒ سے ہوتی ہے۔تحفتہ الارواح میں یہ بھی مذکور ہے کہ شیخ نے سند خلافت کے ساتھ دو غلام عبدالغفور ابدال اور شاہ منور علی عطا فرمائے۔اس واقعہ کے بعد شیخ کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے۔

اَنافی حضرت التقریب واحدی　　یُعَرَّفنِی وحَسْبِیُ ذوالجلال

وَکُلّ رَبِّی لَہٗ قدمٌ　　وَاِنّی عَلےٰ قدمٍ بی بدر الکمالِ

مُریدی لَا تَخف واشِ فَانِّی　　عزومٌ قتِلٌ عِندَ القِتالِ

عَبْدَ القادر المشھورِاسمی

وَجَدِّی صَاحب عَینِ الکَمالِ

شاہ منور علی سے بیعت خلافت شاہ دولہؒ نے سترھویں ماہ ربیع الاول ۵۸۷ھ بروز دوشنبہ بوقت عصر بغداد میں لی اور نفس بغرمی کا خطاب دے کر عبدالغفور ابدال کو خدمت کے لیے ساتھ کر دیا۔منور علی عبدالقاہر سہروردی کے بھانجے تھے۔ان کا شجرہ نسب یہ ہے۔شاہ منور علی بن سید عبداللہ بن سید عبدالرحمان بن سید عثمان بن القاسم جنید بغدادی۔

پھر شاہ منور علی آلہ آباد آ گئے۔

شاہ منور علی نے اپنی کتاب فقر الضعیف میں لکھا ہے:

اٹھائیس برس کی عمر میں بتاریخ اکیسویں ماہ ذوالحجہ ۱۹ھ بروز یک شنبہ بعد نماز مغرب سید عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر بیعت توبہ سے مشرف ہو کر بائیس برس وضو کرانے کی خدمت پر مامور رہا۔بتاریخ ۲۷ ماہ شوال ۵۴۱ھ بروز چہار شنبہ وقت ظہر کے حضرت ممدوح کو وضو کرا رہا تھا۔میں نے عرض کی یا حضرت آب حیات کی کیا کیفیت ہے۔جس کو نوش کرنے سے حضرت خضرؑ کو حیات ابدی

حاصل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے ایک جرعہ آب سید ھے ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا۔اس وقت فقیر کے ہاتھ میں ساڑھے چھ سو برس کی عمر کا آب حیات ہے تو نوش کر لے۔میں نے اسی وقت نوش کر لیا۔اس وقت میری عمر ۵۰ سال تھی الخ.........

''بتاریخ نویں ماہ ذی قعد ۵۴۸ھ بروز دوشنبہ وقت عصر سے حسب حکم جناب ممدوح حضرت کبیر الدین شاہ دولہ صاحب گجراتیؒ کی خدمت میں سرگرم عمل رہا پھر قطب الاسرار حبیب شاہ دولہ گجراتیؒ نے مجھے بتاریخ سترھوی ماہ ربیع الاوّل ۵۸۷ھ بروز دوشنبہ بوقت عصر بیعتِ خلافت ارشاد سے مشرف کیا۔''

یہ واقعہ شیخ عبدالقادر کے وصال کے سولہ برس بعد کا ہے۔شیخ کا وصال سترھویں ماہ ربیع الثانی ۵۷۱ھ کو قبل از نماز جمعہ ہوا۔

''شاہ دولہؒ نے مجھے اپنی کلاہ مبارک اور ایک جلد دعائے حرز ایمانی کی عنایت فرما کر لدٰ آباد بھیج دیا۔اور خود حسب الحکم سید عبدالقادر جیلانیؒ کے بغداد شریف میں حضرت سیف الدین عبدالواہاب رحمتہ اللہ علیہ صاحبزادہ کلاں کو صاحب سجادہ کر کے بلدہ گجرات تشریف لے آئے۔کہ واقع سرحد ولایت افاغنہ میں ہے۔'' (حقیقت گلزار صابری)

الفاظ بلدہ گجراتؒ سے دھوکہ ہوا اور مفتی احمد یار خاں صاحب غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔انہوں نے گجرات کو گجرات پنجاب تصور کر لیا۔اور شاہ دولہ گجراتی (پنجابی) کو کبیر الدین شاہ دولہ گجراتی (بغدادی کاٹھیاواڑی) جانا اور اسی لیے انہیں غوث الاعظم کا خلیفہ اعظم کہا۔ حالانکہ یہ صاحب تحفتہ الارواح تھے جو سید نا عبدالقادر جیلانیؒ کے وصال کے بعد گجرات کاٹھیاواڑ جو ان دنوں پٹھانوں کی سرحد

پر واقع تھا) تشریف لائے۔

ایک اور روایت ''درس القرآن'' کے طفیل شہرت پا چکی ہے کہ شاہ دولہؒ دراصل وہی دُولھا' ہیں جن کی برات دجلہ میں غرق ہو گئی تھی۔ جسے بارہ سال بعد حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے کرامت کے زور سے باہر نکالا تھا۔اس روایت کا تذکرہ نہ پیر بغدادی کی کتابوں میں ہے نہ تحفتہ الارواح میں نہ شاہ منور کی تصنیف میں۔معلوم نہیں اس روایت کے مآخذ کیا ہیں۔

اب ہم حضرت شاہ دولہ گجراتیؒ (پنجابی) کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔اس ضمن میں بحث کی ضرورت نہیں کہ آپ آسمان فقر و ولایت کے درخشندہ ستارے ہیں۔کہتے ہیں شاہ دولہ گجراتی (پنجابی) کا سلسلہ نسب شاہ بہلول لودھی سے ملتا ہے۔منشی گنیش داس 'صاحب نامہ' میں لکھتے ہیں:

''شاہ دولہ دریائیؒ مرید سیدنا سرمستؒ دراصل از قوم افغاناں بود............الخ''

لیکن ان کے مزار کے بیرونی دروازہ پر ان کا نام سید کبیر الدین شاہ دولہ گجراتیؒ تحریر ہے۔ان کی تاریخ پیدائش کسی تذکرے سے دستیاب نہیں ہو سکی۔بہر حال آپ گجرات ہی میں پیدا ہوئے۔بچپن سے داغ یتیمی نصیب میں تھا۔غلام بنا لئے گئے اور ایک ہندو کے ہاتھ بیچ دیئے گئے۔

''غلام زرخرید مہتا کھیم کرن معروف کھیما حلف برار داس بڈہرہ ساکن سیال کوت بود'' (حاشیہ صاحب نامہ' ص ۱۶۰۔الف)

کچھ مدت بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔پھر وہ وڈیرہ کھتریوں کے ملازم ہو گئے۔انہیں کا مال مویشی چراتے تھے۔انہیں دنوں سیالکوٹ میں ایک درویش

(جن کا مزار سیالکوٹ مشن ہائی سکول کے ہوسٹل کے مغرب میں ہے)۔شاہ سید اسر مستؒ تشریف لائے اور وہیں کھتریوں کے طویلے کے پاس ڈیرہ جمایا۔کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس پہنچا تھا۔دولہؒ سرمستؒ کے مرید ہو گئے اور تقریباً ایک سو سال (؟) تک ان کی خدمت کی۔شیخ کا آخری وقت قریب آیا۔دولہ اس زمانہ میں گولہ (غلام) کہلاتے تھے۔سرمستؒ کا ایک اور غلام دولہ نامی تھا۔صاحب سلیم التوریخ کہتے ہیں۔شیخ نے اسے آواز دی 'دولہ' ہے؟ جواب دیا، جی گولہ ہے۔کہا ضرورت نہیں،۔تھوڑی دیر بعد شیخ نے وہی سوال دہرایا اور وہی جواب پایا فرمایا۔

''ہر کرادہد مولا از گولہ شاہ دولہ گردد''

اسی دن سے یہ شاہدولہؒ ہو گئے اور گجرات تشریف لائے۔منشی گنیش داس لکھتے ہیں۔

''چوں زبدۃ الاولیاء شاہ دولہ از سیالکوت آمدہ در گجرات اقامت نمود۔و تالاب و چاہ و مساجد و پُل احداث کرز۔موجب ازدیاد آبادی گشت شجرہ مرشدی ان کا حسب ذیل ہے۔

شاہ دولہ گجراتی شاہ سید اسر مست شاہ مونگا
شیخ شہر اللہ شیخ یوسف پیر برہان الدین
شیخ صدر الدین شیخ بدر الدین شیخ اسماعیل قریشی
شاہ صدر الدین راج قتال شیخ رکن العالم رکن الدین
ابو الفتح ملتانی شیخ صدر الدین عارف شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی
شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمہم اللہ تعالیے علیہم۔

میرزا اعظم بیگ لاہور تاریخ گجرات میں لکھتے ہیں۔

''ان کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا ۔خصوصاً مفاد عام مثل پل' چاہ' تالاب اکثر مواقع پر بنوایا کرتے تھے ۔چنانچہ راستہ لاہور پر پل شاہ دولہؒ صاحب کے پائے جاتے ہیں ۔اور گجرات میں اب تک ایک پل محاذ شرقی' قلعہ کی شرقی فصیل کے بیرونی دروازے (شاہ دولہ گیٹ ) کے بالکل سامنے اس خندق پر موجود ہے۔جہاں آج کل گندہ نالہ بہتا ہےاوران دنوں دریا کا شفاف پانی شہر کی حفاظت کیا کرتا ہے۔

اس پل کی مرمت سرکار انگرزی نے کی تھی میرزا اعظم بیگ کی تحقیق کے مطابق ایک مسجد اور ایک تالاب پختہ جانب شرق اس شہر کے اب تک موجود ہے۔اب صرف مسجد کا محراب اور کئی زینہ تالاب کے نشان باقی ہیں ......... تاریخ گجرات ۱۸۶۷ء میں تقریباً سو سال پہلے لکھی گئی تھی ۔'اب' سے مراد ۱۸۶۷ء ہے ۱۹۶۷ءنہیں ہے۔

''سیالکوٹ شہر میں شاہ سرمستؒ کا پختہ مزار' خانقاہ کی فصیل ،خانقاہ امام علی الحقؒ اور مزارات جو گرد خانقاہ موصوف بعمارت پختہ ہیں ۔یہ شاہ دولہؒ گجراتی کے بنوائے ہوئے ہیں۔'' (سلیم التواریخ ص ۴۰۱)

خزینتہ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۲ پر ان کے حالات زندگی اور معمولات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''ابواب فتوحات باطنی وظاہری بروے مفتوح گشتند ۔خوارق وکراماتِ بے حساب از وے بظہور می آمدند وخلقے کثیر از حاجت مندان دنیا وعقبی بخدمت وے حاضر آمدند ۔بمرادات خودی رسیدند سباح وطیور چوں شاہین و باز شیر و پلنگ بسیار در سرکار روے می بودند ووے دست برخزانہ غیب داشت ۔زر نقد بے شمار و

بے حساب خرچ می کرد۔ ومساکین رامی دادولنگر ہائے عظیم جاری می کردد عمارات عالی ازقسم چاہ وسرائے وپل ومسجد تعمیر می فرمود۔ چنانچہ عمارات دے در گجرات و سیالکوٹ تا حال یادگار دے باقی اند سرکاروے مثل سرکار امر و ملوک بودے استغراق دوام شہود حقانی داشت، اکثر اوقات از ماسوائے اللہ بے خبری بود۔ وسرور مراقبہ می داشت باوجود تعلق بسیار مجرد بودے۔ غرض از مشائخ کرام میسر نہ گردید۔ و ہر چہ از خیر وشر از زبانش بر آمدے ہم چناں بظہور رسید۔ وتیرے دعا ہالے وے گاہے از نشانہ خطا نرفت۔ و در سماع دوجد توجہ وغلوے تمام داشت مجلس عالی گاہی از سماع خالی نہ بودے۔ وقتے حاسدان و ملایاں خشک بروے محضرے نو شتند و در سرایذائے وے۔ گشتند۔ شاہجہان بادشاہ کہ حاکم بے تعصب بود تن بایذائے وے درنداد۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ دولہؒ ایک مجذوب بزرگ تھے۔ جانوروں سے محبت کرتے تھے۔ غیب کے خزانوں پران کا تصرف تھا۔ عمارتوں کا شوق تھا۔ مسافروں غریبوں مسکینوں کے لیے انہوں نے لنگر جاری کر رکھا تھا۔ سہروردی سلسلہ سے تعلق کے باوجود چشتیہ معمولات (سماع) پر عامل تھے۔

شاہجہان ان کی عزت وتکریم کرتا تھا.........سب باتوں کا ذکر تو موجود ہے مگر بچوں کے چڑھاوے کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ دراصل مائی کرو سفالی (چھوٹا سر ہونا) ایک بیماری ہے۔ جو ماں کے پیٹ میں بچہ کو لاحق ہو جاتی ہے۔ پیدا ہونے والا بچہ کوتاہ سر، گنگ اور مخبوط الحواس ہوتا ہے۔ اندھے لنگڑے اپاہج بچوں کو ایک بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے انہیں مسجد میں حفظ قرآن یا فقہ اسلامی پڑھنے کے لیے بٹھلا دیتے ہیں۔ گونگے مخبوط الحواس بچوں کو تو ملاں بھی قبول نہیں کر سکتے

۔ان بچوں کے لیے شاہ دولہؒ کی خانقاہ جائے پناہ ہو سکتی تھی ۔ جہاں انہیں کم از کم دو وقت کی روٹی تو میسر آ سکتی تھی ۔اس وقت سے یہ رواج چل نکلا ۔پھر آدمی نے آدمی کو بھینٹ مان کر اسے گداگر بنا دیا ۔شاہ دولہؒ کے چوہے" گلیوں بازاروں میں بھیک مانگتے پھرتے ہیں ۔

میرزا محمد اختر دہلوی نے تذکرہ اولیائے ہند' ج ۳ ص ۱۶۷۔۱۶۸ پر لکھا ہے:

"شاہ دولہؒ اگر کسی کے واسطے دعائے فرزند کرتے ۔تو اس سے اقرار فرما لیتے کہ جو پہلا لڑکا ہوگا ۔وہ میری نذر' تجھ کو اللہ اور دے گا"

لیکن میرزا محمد اختر نے اس کا مآخذ نہیں بتلایا ہے۔ گجرات میں تو یہ بھی مشہور ہے کہ ماں باپ کا پہلا بچہ جو حضرت شاہ دولہؒ کے مزار پر دعا کا پھل ہوتا ہے ۔جب ان کے مزار پر چڑھا دیا جاتا ہے تو حضرت کے مجاور اس کے سر پر لوہے کا کڑا چڑھا دیتے ہیں ۔اس طرح وہ 'چوہا' بن جاتا ہے ۔مگر اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

شاہ دولہؒ نے اکبری ، جہانگیری اور شاہجہانی تینوں عہد دیکھے ۔یعنی ۹۶۳ھ ۱۰۶۸ھ تک ۔شاہ دولہؒ نے اورنگ زیب کا عہد بھی دیکھا ۔اورنگ زیب حقیقتِ گلزار صابر کے مطابق ۱۰۶۸ھ میں تخت نشین ہوا ۔اور شاہ دولہؒ کی وفات ۱۰۷۵ھ میں ہوئی ۔اورنگ زیب کی بیگم راج محل شاہ دولہؒ کی مرید ہوئی ۔راج محل کا انتقال ۱۱۲۱ھ میں ہوا ۔اور اسے بیگم شاہی مسجد کے احاطہ میں دفن کیا گیا ۔مسجد و قبر اب تک موجود ہیں ۔شاہین کے ایک شمارہ میں مسجد بیگم پورہ کے عنوان سے ایک مقالہ تحقیقی شائع ہو چکا ہے ۔

خزینۃ الاصفیاء میں شاہ دولہؒ کا قطعہ تاریخ وفات درج ہے۔

چو شاہ دولہ ولی باعزت وجاہ
زدنیا رفت درفردوس شاداں
بسرور شدند تاریخ سالش
کہ شاہنشاہ دولہ قطب دوراں

مقامات محمود اور تاریخ گجرات میں ماہ تاریخ کی یہ بیت درج ہے۔

سرخیل آں عارف حق گزیدہ
بگو شاہ دولہ بجنت رسیدہ

تذکرۂ اولیائے ہند جلد سوم اور تحفۃ الابرار جلد چہارم میں مادۂ تاریخ ہے۔

'خدادوست .........۱۰۷۵ھ

صاحب نامہ میں منشی گنیش داس لکھتے ہیں۔

''بتاریخ یک ہزار ہشتادوشش' ہجری ۱۰۸۶ھ در دم عالمگیری شاہدولہ رحلت فرمائے عالم بقاشد۔ ومزارش زیارت گاہ مردم شد۔''

حضرت شاہدولہ کے مزار پر تاریخ وفات کے سلسلہ میں یہ بیت رقم ہے۔

بتوحید آں عارفِ حق گزیدہ
بگو شاہ دولہ بجنت رسید

صاحب تاریخ گجرات لکھتے ہیں:

''مرزا جانب شرق شہر بفاصلہ پنجار کرم بعمارت پختہ چونہ گچ اندر ایک احاطہ پختہ ایک ایک مسجد پختہ مزار کے جنوب کو ہے اور گردونواح خانقاہ کے خدمت گزاران خانقاہ آباد ہیں۔ اس آبادی کا نام گڑھی شاہ دولہ ہے'' .........الخ

تذکرہ اولیائے ہند ص ۱۶۷ اور خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۳ میں ہے کہ

''شاہد ولہ ؒ ساری عمر مجرد ہے۔'' مگر منشی گنیش داس صاحب نامہ میں ص ۱۶۰ الف پر لکھتے ہیں۔

''حلف الصدق او (شاہ دولہ ؒ) دریائی معرفت آگاہ پہاون شاہ ولی زیب سجادہ بود۔ بتاریخ یک ہزار و یک صد و ہفت ہجری بحق پیوست۔ حضرت پہاون شاہ راپنج پسراز دو زوجہ تولد سعادت یافتند از اہلیہ اول مراد بخش و کام بخش واز زوجہ ثانی تین (۳) فرزند ایزد بخش۔ حیات بخش و کرم بخش ایں ہمہ پنج تن چوں پنج پیر فیض بخش صغیر و کبیر بودند۔''

صاحب سلیم التواریخ لکھتا ہے کہ ''مجاورین شاہ ؒ دولہ کی اولاد نہیں۔ ان کے خلیفہ کی اولاد ہیں ...... '' الخ

مقامات محمود کے مؤلف نواب معشوق یار جنگ بہادر ص ۳۶۹ پر ایک روایت چوہدری الہٰ دین کی زبانی آوان شریف کے قاضی حضرت سلطان محمود کی طرف منسوب کرتے ہیں،

''حضرت شاہ دولہ ؒ کا نام کبیر الدین گجراتی تھا اور سید تھے آپ بغداد سے تشریف لائے تھے اور غوث اعظم ؒ کے خلیفہ تھے۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی درس القرآن کے دیباچہ میں انہیں غوث اعظم ؒ کا خلیفہ لکھا ہے۔ اور ان کی عمر ساڑھے چھ سو سال بتلائی ہے۔ مگر یہ شاہد ولہ گجراتی کا ٹھیا واڑی ہیں، تحفتہ الارواح کے مصنف (بحوالہ حقیقت گلزار صابری ص ۶۷، ص ۲۳۸)

تذکرہ اولیائے ہند، ج ۳ ص ۱۲ پر غوالاعظم ؒ کے خلفاء کی فہرست موجود ہے۔ اس میں شاہ دولہ گجراتی پنجابی ؒ کا ذکر نہیں ہے۔ غوث الاعظم ؒ کے پندرہ خلفاء

کے نام یہ لکھے ہیں:

شاہ ابو عمر قریشی بن مرزوق ...... شیخ قصیب البان موصلی ...... شیخ احمد بن مبارک بغدادی...... شیخ ابو سعید قیلوی ...... شیخ صدقہ بغدادی ...... شیخ عمر صیرنی...... شیخ محمد الاوانی ...... شیخ ابو سعید بن شبلی ...... شیخ حیات ...... شیخ ابو موید مغربی شعیب ...... شیخ موافق الدین المقدسی ...... شیخ صدر الدین قونیوی ......شہاب الدین سہروردی...... سید احمد رفاعی ...... شیخ شمس الدین علی حدّاو بن عمر بغدادی۔

مسعود الحسن صاحب ایم اے ۔تمغہ خدمت آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کے سفر نامہ مطبوعہ نظام نو (مئی ۔جون۔ جولائی ۶۷) سے ایک اور شاہ دولہ کا پتہ چلا ہے ۔جن کا مزار شاہی قلعہ کے اندر باگہ کے مقام پر ہے۔

اے سی ایلیٹ نے تحریر کیا ہے کہ۔حضرت شاہ دولہؒ کی پیدائش عہد اکبری میں 1581ء کے مطابق ہوئی۔ ان کے باپ کا نام عبدالرحیم خان لودھی تھا جو سلطان ابراہیم لودھی کے اخلاف میں سے تھا جو خود بہلول شاہ لودھی کا پوتا تھا۔ بہلول شاہ کی وفات 894ھ میں بمطابق 1488 عیسوی ہوئی تھی۔ یوں شاہ دولہؒ کا تعلق پٹھان قبیلے سے بنتا ہے لیکن گجرات کے گوجروں کا کہنا ہے کہ وہ ان کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام نعمت خاتون تھااور وہ سلطان سارنگ گکھڑ کی پڑپوتی تھی۔

سلطان شیر شاہ (60-952ھ بمطابق 53-1545ء) کے بیٹے سلطان سلیم کے عہد میں خواص خاں کو زیر کرنے کے لئے بہت بڑی جمعیت بھیجی گئی تھی کیوں کہ اس نے عادل خاں کے حق میں بغاوت کر دی تھی جو سلیم شاہ کا بڑا بھائی تھا۔خواص خاں کو بُری شکست ہوئی اور اس نے گکھڑوں کے ہاں پناہ

چاہی۔ گکھڑوں نے اس کی امداد کی اور ضلع جہلم میں رہتاس کے پاس رن پڑا جس میں سلطان سارنگ گکھڑ مارا گیا اور اس کے پس ماندگان کو بندیوان بنا لیا گیا۔ سلطان سارنگ کے بیٹے غازی خاں کی ایک بیٹی بھی اسیروں میں تھی جس کی گود میں ایک شیر خوار بچی تھی۔ یہ بچی نعمت خاتون تھی جسے اس کے بھائی کے ساتھ دہلی لے جایا گیا اور اکبر کے اوّل سال جلوس میں (963ھ/1565ء) ہمایوں کی وفات کے جلد بعد ہی اس کی شادی عبدالرحیم لودھی کر دی گئی تھی جو کہ ان دنوں شاہی محل میں ملازم تھا۔ لیکن شاہ دولہؒ اس شادی کے تقریباً 25 سال بعد (989ھ۔ 1580ء) پیدا ہوئے اور اسی سال ان کا باپ فوت ہو گیا۔

شاہ دولہؒ کہاں پیدا ہوئے اس کا تو پتہ نہیں چلتا ہاں ان کی بیوہ ماں اپنے آبائی وطن پتھاس چلی گئی جس سے اب جہلم اور راولپنڈی اضلاع کا علاقہ مراد ہے۔ یہاں آ کر اس نے محسوس کیا کہ ہر چند وہ سلطان سارنگ کی پڑپوتی تھی لیکن وہاس جگہ اب اتنی ہی اجنبی تھی جتنی کہ ہندوستان میں تھی اور کسی کو اس کا یا اس کے زوال نصیب خاندان کا کوئی پاس نہیں تھا۔ پانچ سال تک یہاں اسے سہالہ میں جو کہ پھروالہ پرگنہ کا ایک گاؤں تھا چکی پیس کر پیٹ پالنا پڑا جہاں سے وہ ''کالا'' میں چلی گئی اور وہیں 998ھ یعنی 1590ء میں چار سال مزید دکھوں کے دن کاٹنے کے بعد وفات پا گئی۔

اس سلسلہ میں ہمیں مفصل بحث جو کہ حد درجہ تحقیق کی حامل ہے جو دستیاب ہوئی۔ وہ جناب پروفیسر شریف کنجاہی صاحب کی ہے جو کہ فاضل مؤلف نے حیات وتعلیمات، حضرت شاہ دولہ دریائی ” نامی کتاب کے صفحہ نمبر 2 سے

شروع فرمائی ہے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ۔

''حضرت شاہ دولہؒ صاحب جن کا نام ان کے مزار پر سید کبیر الدین شاہ دولہ دریائی گنج بخشؒ لکھا ہوا ہے با خدا لوگوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں کسی اور مزار پر ماں باپ کو اپنی اولاد کا انذرانہ پیش کرتے ہوئے نہیں پایا گیا اور کہیں بھی اولاد آدم کو سر کی ایک مخصوص ہیئت کے باعث کسی خدا دوست سے منسوب نہیں کیا گیا۔ لیکن حضرت شاہ دولہؒ کے بارے میں یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ اس انفرادیت کے باوجود مقام حیرت ہے کہ آپ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں واضح عصری حوالے نہیں ملتے۔

اس قدر ضرور پتہ چلتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کی شخصیت تھے۔ لیکن اُن ایام میں پیدائش اور موت کا باقاعدہ اندراج کہیں نہیں ہوتا تھا اور کسی نومولود کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ عالمگیر شہرت کا مالک ہوگا اس لئے یوم وصال ولادت کے تعین کی جب کسی شخصیت کے بارے میں ضرورت محسوس ہوتی وقت بہت آگے نکل چکا ہوتا۔ چنانچہ شاہ دولہؒ صاحب کے بارے میں بھی ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کب پیدا ہوئے کہاں پیدا ہوئے اور ماں باپ نے آپ کا نام کیا رکھا تھا۔

حقیقت گلزار صابری کے مصنف نے آج سے تقریباً ایک سو سال قبل یہ لکھ کر کہ آپ 499ھ (حقیقت گلزار صابری ص 73 مطبع حسنی رام پور) میں پیدا ہوئے اور 603ھ میں انتقال فرمایا اس بات کے لئے گنجائش پیدا کر دی کہ جس

طرح گجرات ایک سے زیادہ ہیں اسی طرح شاہ دولہؒ بھی ایک سے زیادہ ہوں گے۔ اس خیال کی تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ ڈپٹی مولوی عبدالعلیم صاحب کی تصنیف تاریخ دکن (مطبوعہ نول کشور 1285ھ) میں حضرت حمید شاہ دولہؒ حضرت (احمد علی شاہ دولہؒ) اور حضرت کرامت شاہ دولہؒ کا ذکر آیا ہے۔

جس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دولہ (دولہ نام اس دور میں ایسا غیر معروف نہیں تھا۔ ماثر الامراء میں دولہ رائے کا ذکر آیا ہے جس نے 31 جلوس اکبری میں ایک غارت گر کو مارا تھا۔ اس طرح مرأۃ العالم میں کوہستان دولہ بھی آیا ہے جس کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ اسے یہ نام کیسے ملا) یا شاہ دولہ ضروری نہیں کہ اصل نام ہو بہت سے توصیفی اضافوں کی طرح ماضی میں مستعمل و مروج ایک اضافہ بھی ممکن ہے جس طرح گنج بخش کی توصیفی ترکیب کو ہم حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے نام کا حصہ بھی پاتے ہیں۔ ساہن پال (گجرات پنجاب) والے نوشہ صاحب کا بھی اور شاہ دولہ صاحب گجراتی کا بھی۔ مزار کے برآمدہ میں منظوم شجرہ بیت کا آخری شعر ہے۔

جناب ابوالفضل محبوب محبوب
محمد شاہ دولہ شیر مطلوب

یہاں دولہ کو شیر مطلوب کی طرح توصیفی شمار کیا جا سکتا ہے اور یوں جیسا کہ صاحب تذکرہ شاہ دولہؒ (تذکرہ شاہ دولہؒ از نسیم چوہدری ص 90) نے ایک جگہ اشارۃً کہا ہے ممکن ہے آپ کا نام محمد شاہ ہو۔ سیر السلوک کے اس قلمی نسخہ پر جو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کی ملکیت ہے مصنف کا نام شاہ قاسم المشہور بشاہ

دولہ بحری" لکھا ہوا ہے اور یوں ممکن ہے آپ کا نام قاسم ہو۔

گلزار ابرار مصنفہ محمد غوث شطاری میں شیخ جوئباری کے ایک معاصر شیخ قاسم بتائے گئے ہیں اور جوئباری کی وفات 980ھ لکھی گئی ہے۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کا نام محمد شاہ یا شاہ قاسم تھا تو درگاہ پر کیوں لکھا نہ گیا اور کیوں کسی تذکرہ نگار یا تاریخ نویس نے اس طرف اشارہ نہ کیا۔ یہ اعتراض متذبذب ضرور کر دیتا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں بزرگوں کا ذاتی نام لینا ادب سے دور گنا جاتا تھا ثانوی ناموں کو اصلی ناموں کا بے دخل کر جانا موجب حیرت نہیں رہتا۔ اور اسی بنا پر لوگوں کو بابا فرید شکر گنج " کا ولادتی نام (مسعود) (سیر الاقطاب نیز انوار العارفین (292) نیز افکار ابرار (اردو ترجمہ گلزار ابرار، ص 48) بہت کم معلوم ہے اور حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان کا ذاتی نام آج کسی کو بھی معلوم نہیں اور والدہ کا دیا ہوا نام (باہو) ہی حقیقی نام گنا جاتا ہے۔ (باہو کو میں اس بنا پر ان کا ابتدائی نام نہیں گنتا کہ یہ لفظ نہ ان سے پہلے کسی کا نام رہا ہے اور نہ بعد میں۔

سلطان العارفین نے ضرور اسے اپنا نام لکھا ہے لیکن اس لئے کہ وہ والدہ کا رکھا ہوا تھا اور ایک نقطہ سے "یاہو" بن جاتا تھا۔) ایسی ہی قیاس آرائی شاہ دولہ" کی ترکیب یا محض دولہ کے بارے میں کی جا سکتی ہے "دولہ" اپنے مزاج کے اعتبار دولت ہی کی ایک شکل ہے (دولہ" کے مختلف معنی اہل علم نے یہ دیئے ہیں ملک۔ شاہی خاندان۔ عہد حکومت۔ زمانہ۔ نبوت (باری) راجن قتال کی اولاد میں بھی

ایک شاہ دولت ہوئے ہیں۔انکی اولاد ضلع گجرات میں بھی آن بسی تھی۔

ایک شیخ دولت گجراتی (وفات1015ھ) گلزار ابرار میں مذکور ہیں)

اور برصغیر میں دولت رام، دولت خان اور دولت شاہ ایسے ناموں کا جزواوّل ہے اور بے شمار دعائیہ ناموں میں سے ایک نام۔شاہ دولہ بظاہر دولت شاہ کا ہم معنی ہے اور دعائیہ ہونے کے ساتھ ساتھ گنج بخشی مزاج بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ قیاس ادھر جاتا ہے کہ دنیاوی فرماں روائیوں کے مقابلہ میں بلکہ ان سے بالاتر معنوی فرماں روائیوں کے قائل لوگ اصل فرماں روا اور حاجت روا خدا کے بعد اہل اللہ ہی کو خیال کرتے تھے اور ان بزرگوں کو ایسے ناموں سے یاد کیا جانا شاہان دنیا کے خلاف ایک ویٹو کر دیا گیا ہوا کثریتی فیصلہ تھا۔جو کوسِ "لمن الملك اليوم" بجاتے رہتے ہیں۔(القرآن16:40)یوں شاہ دولہؒ سے مراد صاحب دولت ہوسکتا ہے لیکن ایسا صاحب دولت جس کے پاس جو کچھ ہے اہل حاجت کے لئے ہے۔دنیاوی بادشاہوں کے برعکس جن کی دولت اور بخشی کے بارے میں ابن حزیں نے کہا ہے۔

طعام چرب و شیریں سلاطین
جواب تلخ دربانے نیرزد

غرض خارج از امکان نہیں کہ گنج بخش کی طرح شاہ دولہ بھی توصیفی نام ہو۔مگر میں شاہ کو دولہ کا حصہ قرار نہ دینے پر تھوڑا سا اصرار کرتا ہوں تو اس لئے کہ کیگو ہرنامہ میں دلاور خان گکھڑ کا ذکر کرتے ہوئے اس کا مصنف رائے زادہ دنی چند لکھتا ہے (کیگو ہرنامہ، ص165، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈیمی، لاہور) کہ اس

کی کشادہ دوستی کے باعث لوگ اُسے دولو دلا ور کہا کرتے تھے اِدھر دولو اور دولہ میں بڑی مماثلت ہے اور فارسی میں چونکہ ''ڈ'' کی آواز ''د'' سے بدل جاتی ہے اس لئے مجھے خیال گذرا کہ لفظ اصل میں ''ڈوہلو'' ہوگا یعنی بہانے والا (پانی کی طرح روپے کو)

''د'' اور ''ڈ'' کا یہ تبادلہ ہمیں ''سوڈان'' میں بھی ملتا ہے جو اصل میں ''سُودان'' تھا لیکن انگریزوں نے اسے یوں سوڈان بنایا کہ برصغیر میں وہ ملک اپنا اصلی نام کھو چکا ہے اور وہ جو دکن کے بعض اہل اللہ کے نام کا حصہ بھی یہی لفظ ہے تو اس کا باعث بھی یہی ہو سکتا ہے کہ دکنی زبان اور پنجابی پوٹھوہاری زبان کا بیشتر سرمایہ الفاظ مشترک ہے اور دکنی شعراء کے کلام کو سمجھنا اسی لئے اہل پنجاب کے لئے دوسروں کی نسبت زیادہ آسان ہے لیکن اس ضمن میں مزید بررسی اور کنج کاوی کی ضرورت ہے اور اگر اس بات میں ارباب تحقیق کو کوئی وزن محسوس ہو تو پھر ''دولہ'' ایک توصیفی اضافہ ہی مانا جا سکتا ہے اور مزید کھوج ممکن ہے ہمیں اسی نام پر لے آئے جو سیر السلوک کے آغاز میں سرورق پر درج ہے یعنی شاہ قاسم۔

سلیم التواریخ میں لکھا ہے کہ شاہ سیدؒ نے دولہ کو خدمت گذاری میں مستعد پاتے ہوئے آپ کے حق میں کہا تھا کہ ہر کرا مولا دہداز گولا شاہ دولہ گردو۔'' ممکن ہے اس کے بعد یہی ترکیب آپ کے لئے یوں مخصوص ہوئی کہ نام بن کر رہ گئی۔ یہ جملہ خزینۃ الاصفیاء کے اس جملہ سے زیادہ برمحل ہے کہ ''ہر کرا مولا دہد شاہ دولا گردد'' تذکرہ شاہ دولہ کے مصنف نے کبیر الدین کو آپ کا ذاتی نام

قرار دیا ہے لیکن کسی حوالے یا ثبوت کے بغیر۔ اسی لئے راقم کا خیال ہے کہ یہ بھی آپ کا توصیفی نام ہی تھا۔ کیونکہ آج سے قبل اس قسم کے اضافوں کا عام رواج تھا اور شاہان مغلیہ کے ناموں کو ہی ہم ظہیر الدین۔ جلال الدین اور نور الدین ایسی ترکیبوں سے مزین ہی نہیں پاتے بلکہ عوام سے بلند معاشی، معاشرتی یا مذہبی قدر و قامت رکھنے والے لوگوں کے اسماء ذاتی کا یہ ترکیبیں حصہ ہوا کرتی تھیں۔ (شیخ اسمٰعیل بخاری سہروردی کو بھی کبیر الدین کہا جاتا تھا)۔

شاہ دولہؒ صاحب کے نام کے جزو کے طور پر ترکیب ہمیں سب سے پہلے حقیقت گلزار صابری میں ملتی ہے اور پھر آئینہ تاریخ تصوف میں لیکن دونوں جگہ اس سے مراد وہ شاہ دولہؒ ہیں جن کو بتاریخ نویں ماہ ذی قعدہ 548ھ بروز دوشنبہ بعد عصر محفل عام میں اپنے سامنے بٹھا کر بیعت امامت وارشاد سے مشرف کر کے کلاہ اپنی حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ (اسی نام کے ایک بزرگ اکبری دور میں بھی تھے۔ ہو سکتا ہے ان سے آپ کو ابتداء میں تعلق خاطر رہا ہو۔ تذکرہ شاہ رکن عالم میں مولانا نور احمد خان فریدی صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے) نے اپنے ہاتھ سے اوڑھائی' عمامہ سبز اپنے ہاتھ سے باندھ کر خرقہ پہنایا اور شال خلافت بخطاب قطب الاسرار حبیب کے اہل محفل کو سنا کر مرحمت فرمائی۔'' اور جو بعد میں حضرت غوث الاعظم کے تعمیلِ ارشاد میں اس گجرات چلے گئے جو سرحد افاغنہ پر واقعہ تھا اور جن کی وفات 602ھ میں ہوئی اور جن کا مزار احمد آباد گجرات میں ہے لیکن جن کے بارے میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے کسی سوانح نگار کے کسی سوانح نگار

نے کہیں اشارہ تک نہیں کیا اور نہ مصنف مذکور کی نگاہ اس طرف اٹھی ہے کہ احمد آباد تو اس سن وصال سے بہت بعد میں بسایا گیا تھا۔ (خلاصۃ التواریخ (92) میں درج ہے کہ جب سلطان احمد بن سلطان محمد بن سلطان مظفر شاہ 813ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا تو دریائے سابرمتی کے کنارے مضبوط قلعہ تعمیر کیا۔ عمدہ عمارتوں سے ایک وسیع شہر کی بنیاد ڈال کر احمد آباد نام رکھا)

دوسری بار یہ ترکیب شاہ دولہؒ صاحب (گجراتی پنجاب) کے دربار پر ملتی ہے۔ یہ مزار اولاً آپ کے جانشین بھاون نے بنوایا تھا لیکن اس پر کسی کتبے کے ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا اور اگر کوئی تحریر تعویذ لحد پر ہوتی تو وہ آگے بھی چلتی جب 1876ء میں اسے قدرے بلند کر کے بنایا گیا تھا کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ آس پاس کی زمین کی سطح بلند ہو کر مزار مبارک کے برابر تک پہنچ چکی تھی اور قرب دریا سے سیلاب کے دنوں میں چناب کے اچھلے ہوئے پانی کی زد میں تھی۔ اس وقت بھی اس پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔

موجودہ گنبد نما مزار 1898ء میں قاضی سلطان محمود صاحب کی سعی سے تعمیر ہوا اور ان کے کہنے پر ہی پہلی بار آپ کے نام والی وہ تحریر زینت مزار بنی جو موضوع بحث ہے کیونکہ جب تک مزار محض ایک چبوترہ کی شکل میں تھا کسی جگہ نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی والدہ سے معلوم ہوئی جن کو اپنے والد حکیم حافظ غلام احمد سے معلوم ہوا تھا جو دربار والی مسجد کے امام اور قاضی سلطان محمود صاحب کے حلقہ نشینوں میں تھے۔

اس قسم کی لیکن اس سے کسی قدر مختلف معلومات ڈاکٹر مظفر حسن ملک صاحب نے مزار کے بارے میں فراہم کیں۔ ملک صاحب کی قاضی صاحب سے قرابت داری بھی تھی اور اس حوالہ سے انہوں نے صاحبزادہ محبوب عالم صاحب (مرحوم) سے جو کچھ دریافت کیا تھا اس کا ماحصل یہ ہے کہ قاضی صاحب نے آس پاس کے عمر رسیدہ لوگوں کی مدد سے مزار کی نشاندہی کی تھی جو تقریباً مٹی میں دب چکا تھا اور اس پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں تھا۔

صاحب ''تذکرہ شاہ دولہؒ'' نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے عبارت حقیقت گلزار صابری سے لی تھی جو ناممکن نہیں ہے کہ وہ کتاب 1890ء میں شائع ہوئی تھی اور مزار 1898ء میں تعمیر ہوا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ قاضی صاحب کو مغالطہ ہو گیا ہو جو تقاضائے بشریت ہے۔ لیکن ''مقامات محمود'' کے مصنف نے کہیں بھی صراحتاً نہیں لکھا کہ شاہ دولہؒ گجراتی وہی ہیں جن کو جناب غوث اعظم کا خلیفہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔

بلکہ واضح طور پر مذکور ہے اور خود صاحب تذکرہ نے بھی وہ عبارت نقل کی ہے کہ ''اس بیان کی جو آپ کی ولادت اور بطور اویسی توسل قادری کی شرح میں ہے، مؤلف ہذا کو کوئی سند نہیں ملی۔'' (تذکرہ شاہ دولہؒ ص 54) اور مقامات محمود کے مصنف نواب معشوق یار جنگ بہادر نے یہ جو لکھا (مقامات محمود، ص 368) کہ آپ (یعنی) شاہ دولہؒ صاحب) حضرت شیخ الجن والانس حضرت میراں سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے عم زادہ تھے۔ آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کی

برکات اور فیوض حاصل کئے اور ایک طویل عمر پائی۔ گجرات میں بڑے پیر کے حکم سے آئے۔

آپ کا ایک مزار احمد آباد گجرات (کاٹھیاوار) اور ایک شہر گجرات پنجاب میں ہے۔۔۔'' تو اس روایت کو قاضی صاحب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس روایت کو بھی جو مقامات محمود میں قاضی صاحب کے ایک مرید سے سن کر قاضی صاحب سے منسوب کر دی گئی کہ آپ بغداد سے تشریف لائے (مقامات محمود، 329) اور جناب بڑے پیر صاحب غوث اعظم ﷺ کے مرید اور وضو کرانے والے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت شاہ دولہؒ نے وضو کراتے وقت جناب بڑے پیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آب حیات کیا ہے۔ آپ نے فرمایا میری ایک چلو پانی میں پانچ سو سال کی عمر ہے۔ حضرت شاہ دولہؒ صاحب نے لپک کر وہ پانی پی لیا اور تقریباً چھ سو سال عمر پائی۔

اس روایت کا خام ہونا اسی سے واضح ہے کہ چلو پانی میں جس قدر عمر تھی آپ نے اسی روایت کے مطابق جو اصل میں شاہ دولہؒ صاحب کے مرید منور علی صاحب کے متعلق ہے، اس سے زیادہ عمر پائی۔ پھر یہ روایت قاضی صاحب نے خود مصنف کو کیوں نہ بتائی جو اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ صاحبزادہ محبوب عالم صاحب کو کیوں اس کا علم نہ تھا جو بیشتر وقت آپ کے پاس رہتے تھے۔ لیکن ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ قاضی صاحب نے آپ کو سید کبیر الدین کیوں لکھا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ حقیقت گلزار صابری میں مذکور شاہ دولہ

اوّل کی رعایت سے آپ نے شاہ دولہؒ ثانی کے لئے بھی وہی توصیفی اضافہ پسند کیا ہو۔ جس طرح بعض عبدالرحمٰن نام والے لوگوں نے جامی کا اضافہ کرلیا ہوا ہے حالانکہ وہ جام کے رہنے والے نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے قاضی صاحب آپ کو معنوی طور پر کبیر الدین ہی سمجھتے ہوں جس کی شہادت آپ کی برٹش میوزیم والی تصویر بھی کرتی ہے جو کو زینت بخش رہی ہے اور عرفانی مسلک کے حوالے سے ''سیر السلوک'' کے اوراق ہیں جن کا خلاصہ شامل تالیف ہے۔

اب لفظ دریائی کی طرف آتے ہیں۔ اس کے متعلق سب سے پہلی روایت چراغ قادری کی ہے جس کے والد شاہ دولہؒ صاحب کے ارادت مند تھے اور جس نے آپ کے احوال پر ایک رسالہ آپ کی وفات کے جلد بعد تحریر کیا اس کی ایک نقل قاضی حسین مدرس بورڈ سکول گجرات نے 12 جون 1899ء کو مکمل کر کے میرے نانا جی کو پیش کی تھی۔ اس میں درج ہے کہ جب شاہ دولہؒ صاحب کے پیر شاہ سیدا مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو ان کی حالت نازک جان کر آپ کے بالکے منگو نے کہا کہ میں دوائی لینے جموں جاتا ہوں اور کسی طبیب کو لاتا ہوں تو ان کی خدمت میں رہنا۔

ایک پہر ہی گزرا ہو گا کہ آپ نے اونچی آواز سے کہا تو کون ہے شاہ دولہؒ صاحب نے عرض کی کہ بندہ دولا ہے۔ سن کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پوچھا کہ تو کون ہے آپ نے عرض کی کہ بندہ دولا ہے۔ پھر خاموش ہو گئے اور جب کچھ گھڑیاں گذر گئیں تو بڑے جلال میں آ کر فرمانے لگے تو کون ہے آپ

نے پھر عرض کی کہ بندہ دولہ ہے۔ فرمانے لگے کہ منگو کہاں ہے۔ عرض کیا کہ طبیب لانے کے لئے جموں گیا ہے آپ نے فرمایا کہ اس کا نصیب۔ اے دولہؒ آ کہ "جسے دے تسے مولا"

چنانچہ جب آپ قریب ہوئے تو وصیت کی کہ اس گلیم کو سنبھال کر رکھنا کہ تیری زندگانی کی پردہ پوش ہوگئی۔ میرے گھرانے کی آگ کو زندہ اور تازہ رکھنا کہ اس کی برکت سے تیرے فقر کی رونق گرم اور تازہ رہے گی۔ قریب آ اور اپنا منہ میرے منہ پر رکھ دے۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اللہ اللہ کہا اور اپنے دہن کی سانس آپ کے دہن میں پھونک دی۔ دم سادھ لیا اور عالم بقا کو چل دیئے۔ شاہ دولہؒ صاحب پر بیخودی سی طاری ہوگئی جس میں چمنستان ظہور جلال و جمال میں اپنے آپ کو پہنچا ہوا پایا۔ بحال ہوئے تو تجہیز و تکفین میں لگ گئے۔ فارغ ہو کر گھر کو لوٹے تو ہر قدم پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ عالم بالا سے آواز آ رہی ہے اے شیخ دولا "جسے دے تسے مولا" لوگ آپ کے گرد ہجوم کر آئے اور نعرے لگانے لگے "دم ہو دولا دریائی۔ تنگی گئی فراخی آئی۔"

یوں پہلی بار چراغ قادری نے آپ کے نام کے ساتھ دریائی کا اضافہ ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن معاصر ہونے کے باوجود اس کے اس بیان سے عیاں نہیں ہوتا کہ آپ کو دریائی کیوں کہا گیا اور اس موقع محل کے مطابق اس نعرے کو گنا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ہم دوسری قریبی شہادت کی طرف آتے ہیں جو ہمیں مشتاق رام کے مرتب کئے ہوئے کرامت نامہ میں ملتی ہے۔ یہ کرامت نامہ

مؤلف کے اپنے بیان کے مطابق 1132 ھ میں لکھا گیا۔ یعنی شاہ دولہؒ صاحب کے وصال سے تقریباً نصف صدی بعد اس میں درج ہے۔ (کرامت نامہ قلمی مملوکہ حکیم ضیاء الرحمٰن ص 54) کہ ایک چاہ آب شور کا تھا اور وہ خار وخس سے اٹا پڑا تھا۔

حضرت سیدنا سرمست نے آپ کو فرمایا کہ اس کو صاف کر دیا جائے۔ چنانچہ جب آپ نے ایک شخص مانا کھوکھر کو ساتھ لے کر اسے صاف کیا تو وہ آب شور آب شیرین میں تبدیل ہو گیا۔ آپ اس میں سے ایک کوزہ بھر کر مرشد کامل کے پاس لے گئے۔ جس نے خوش ہو کر کہا کہ اے سخی شاہ دولہؒ دریائی۔ تنگی گئی فراخی آئی اور یہ خطاب تیرے لائق ہے بلاشبہ چاہ آب شور کا چاہ آب شیریں میں تبدیل ہو جانا تنگی کی جگہ فراخی کی نوید بن جاتا ہے۔ لیکن اس اعجاز کا لفظ دریائی سے کوئی تعلق نہیں بنتا اور یوں دونوں قریب ترین حوالے آج کے ذہن کو مطمئن نہیں کرتے۔

شاید اسی عدم اطمینان کے باعث مختلف لوگوں نے مختلف تاویلیں کیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ آپ کو دریائی اس لئے کہتے تھے کہ آپ کی سخاوت دریا کی مانند تھی۔ نیز یہ کہ آپ دریا سے جس وقت بھی چاہتے بغیر کشتی کے سوکھے قدم پار ہو جایا کرتے تھے۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ آپ نے بہت سے پل بنوائے اس لئے دریائی کہلائے۔ لیکن اگر دریائی کہلانے کا باعث پُل بنوانا ہی ہوتا تو مذکورہ بالا دونوں ارادت منداس ضمن میں اس طرف اشارہ کرتے۔ اسی لئے راقم کا خیال

ہے کہ دریا کے کنارے آپ کے ڈیرا لگانے سے آپ کا نام دریائی پڑ گیا اور اس دور میں ایسے نام اور بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب یوسف خواجہ جوئباری ہوئے ہیں جن کا ذکر شاہ جہاں نامہ میں آیا ہے اور ان کے بھائی یعقوب جوئباری کا ذکر منتخب اللباب میں ملتا ہے۔ بلکہ بہلول دریائی معروف اہل اللہ ہوئے ہیں جنہوں نے کوئی پل نہیں بنایا لیکن اسی نام سے معروف ہوئے اور نہ کسی کھارے پانی کے کنویں کو میٹھے پانی میں تبدیل کیا۔ تحفتہ الکرام میں قاضی محمود دریائی کا ذکر ہے کہ ان کو ڈوبتی کشتیاں ملاحوں کی عرض والتجا سن کر بچانے کے باعث دریائی کہا جاتا تھا۔ شاہ دولہؒ صاحب کو بھی ممکن ہے اسی لئے دریائی کہتے ہوں۔

اب ہم لفظ سید کی طرف آتے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں شاہ دولہؒ صاحب سید تھے۔

**اوّل:** اس لئے کہ قاضی سلطان محمود صاحب نے آپ کو سید لکھا اور بمصداق حدیث گرچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند۔ قاضی صاحب کا آپ کو سید لکھنا اور چراغ قادری (والے رسالے سے واقف ہونے کے باوجود) شاہ دولہؒ صاحب کو سید ماننے کا وقیع جواز بنتا ہے بشرطیکہ ہم کشف و عرفان کو بھی جو اسی علم کی طرح قابل اعتماد ذریعہ آگاہی کا تسلیم کریں۔ جیسا کہ اقبالؒ ایسے عصر حاضر کے مفکروں کے ادھر رجحان سے ظاہر ہوتا ہے۔

**دوم:** اس لئے کہ تذکرہ شاہ دولہؒ میں درج 1868ء کے کاغذات مال کے حوالہ سے بھی شاہ دولہؒ قریشی (یعنی عربی الاصل) بتائے گئے ہیں اور اگر

ساتھ ہی قوم فقیر لکھی گئی ہے تو اس لئے کہ اسلامی دور میں صوفیاء اپنے آپ کو فقیر کہنا پسند کرتے تھے یہ لفظ اس دور میں گداگر کا مترادف نہیں تھا۔ اسی طرح جیسے اہل شریعت اپنے آپ کو علماء لکھتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کی نسبی ذات نہیں ہوتی تھی۔

لیکن میرے نزدیک سب سے اہم دلیل آپ کو غیر عجمی ماننے کی یہ ہے (شیخ سید اور شاہ تینوں القاب اعزازی ہیں اور ابتدا میں کسی نسلی یا نسبی تخصیص کی بنا پر ناموں کا حصہ نہیں ہوتے تھے۔ برصغیر میں رفتہ رفتہ سید اور شاہ اولاد فاطمۃ الزہراؓ کے ساتھ مخصوص ہوتے گئے۔ اسی بنا پر شاہ کا لفظ جس کے نام کا حصہ ہوا سے اخلاف اہل بیت میں سے شمار کیا جاتا ہے اور اسی بنا پر شاہ دولہؒ صاحب کو روضہ قیومیہ میں (جو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے اخلاف کا تذکرہ ہے اور 1164ھ کی تالیف) شاہ دولہؒ گجراتی لکھنا بھی آپ کو سید ماننے کا ایک وقیع جواز بنتا ہے۔

روضہ قیومیہ کے الفاظ یہ ہیں۔ ''شاہ دولہؒ گجراتی ہم عصر حضرت ایشان است۔ مرد صاحب جذب بود۔ اما ازوی کسی را فائدہ باطن نرسیدہ۔'' اگرچہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا یہ الفاظ اسلامی دور میں نسبی یا نسلی حوالوں سے قطع نظر کرتے ہوئے عرفانی لوگوں کے لئے بولا برتا جاتا تھا۔ بلھے شاہؒ کے مرشد شاہ عنایتؒ کہلاتے تھے اور اسی طرح شاہ دولہؒ صاحب کے مرشد شاہ سیدا بھی جو کہ سلیم التواریخ کے مصنف نے ارائیں قوم قبیلے میں سے ظاہر کیا ہے۔) دوسری روایتیں ان کے حسب نسبت کے بارے میں جو کچھ کہتی ہیں تاریخ ان کی تصدیق نہیں کرتی اور ہر

چند سید نہ ہونا عرفانی مسلک میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اہل ارادت کے لئے شاہ دولہؒ صاحب کے معنوی محاسن وجہ کشش تھے نہ کہ ان کا شجرہ نسب۔

نیز دولت عرفان کا دامن مراد میں آنا خون و نسل کا مرہون نہیں ہوتا اور جسے محروم رکھنا ہوا اسے قدرت طبیب لانے کے بہانے جموں بھیج دیتی ہے اور۔ جسے نوازنا ہو اس کے پاس رہنے کا خود بخود جواز پیدا کر دیتی ہے۔''

گذشتہ حوالہ جات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کو افغان ثابت کیا گیا ہے یعنی لودھی خاندان کا فرد ثابت کیا گیا۔ مگر ابھی جو تحریر آپ نے جناب محترم پروفیسر شریف کنجاہی صاحب کی ملاحظہ فرمائی ہے اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ سید تھے۔

اگرچہ سید یا شاہ اعزازی القاب ہی کہے جاتے ہیں اور چند صدیاں بیشتر یہ ناموں کا حصہ بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو ہرگز بیجا نہ ہوگا کہ برصغیر کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں ان کا وجود کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر برصغیر میں سید اور شاہ کو خصوصیت کے ساتھ صرف اور صرف سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمتہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولادِ اطہار کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے کچھ عرصہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اب جس شخصیت کے نام کے ساتھ شاہ لکھا ہوتا ہے اسکو عام طور پر سادات ہی میں سے تصور کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو وزنی جواز ہمیں کتب تاریخ میں دستیاب ہوتا ہے وہ ہے حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفائے کرام کا تذکرہ جو کہ 1164ھ کی

تالیف ہے اس کا نام ''روضہء قیومہ'' ہے اس میں تحریر ہے کہ

''شاہ دولہ گجراتی، ہم عصر حضرات ایشاں است۔ مرد صاحب جذب بود اما از وی کسی را فائدہ باطن نرسیدہ۔''

چنانچہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ الفاظ ہی آپ کے نسبی طور پر سید ہونے کے لئے کافی ہیں۔ مگر دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض غیر سید شخصیات کو بھی شاہ کہا جاتا ہے یعنی حضرت شاہ عنایت قادری علیہ الرحمۃ جو کہ حضرت بابا بلھے شاہ علیہ الرحمۃ کے مرشد کامل تھے اور شاہ ولی اللہ محدث دھلوی جو کہ دراصل فاروقی النسب ہیں ان کو بھی ان کی بلند درجہ شخصیت کی وجہ سے شاہ کا لقب دیا گیا۔

اس طرح ترمذی صاحب نے جو کہ گوجرانوالہ اور گجرات کے سیشن جج تھے ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھتے ہوئے حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ کے بارے میں یوں تحریر فرمایا۔

The Possibility of his being a Syed cannot be ruled out these are instances when an important name inhistory has been claimed by different tribes.

تاریخی کتب میں سے پہلے ''خلاصۃ التواریخ'' نامی کتاب میں آپ کو باقاعدہ طور پر سید کہا یا ہے۔ خلاصۃ التواریخ اردو ترجمہ کے صفحہ نمبر 116، 117 پر رقم ہے کہ ''چونت کے دو آبے میں گجرات کا پرانا قصبہ ہے۔ اکبر کے عہد میں

سیالکوٹ کے کچھ دیہات الگ کر کے یہ پرگنہ قائم کیا گیا تھا۔ اوّل اوّل چنداں آباد نہیں تھا۔ جب زبدۃ اولیاء شاہ دولہؒ نے یہاں بودوباش اختیار کر کے مسجدیں، کنویں اور تالاب بنائے۔ بلکہ دریائے چناب پر جوگاہ بگاہ اس قصبے کو ضرر پہنچاتا تھا مضبوط پُل بنوا دیا تو اس کی رونق و آبادی بڑھ گئی۔ شاہ دولہؒ نوجوانی میں کھیما بدھرہ سیالکوٹی کے غلام تھے۔ فقراء سے بالخصوص حضرت میاں سید باہ کی رحلت کا وقت آیا تو شاہ دولہؒ پر نظر کیمیا اثر ڈالی۔ وہاں ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ شبستان ضمیر نورِ معرفت سے جگمگا اٹھا۔ تب یہ سیالکوٹ سے چل کر گجرات میں آٹھہرے۔ روشن ضمیری کی بدولت زمین و آسمان کے خزانے انہیں نظر آتے تھے جا بجا پُل اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔ بالخصوص ایمن آباد سے پانچ کوس لاہور کی جانب شاہراہ پر ڈیک نالے کا پل ایسا مضبوط بنوایا کہ بادشاہ اور امیر بھی نہیں بنوا سکتے۔ شاہ دولہؒ کے زمانہ حیات میں چار دانگ عالم کی خلقت ان کی قدم بوسی کے لئے آتی تھی۔ نقد وجنس کا چڑھاوا اتنا چڑھتا کہ حد تھی نہ حساب۔ وہ دانائے اسرار الٰہی زائروں کو ان کی نذر نیاز سے افزوں اور حاجت مندوں کو خواہش سے زیادہ عطا کرتا تھا۔ اتنی فیض بخشی کی کہ لوگ حاتم کا نام بھول گئے۔ 17 جلوس عالمگیری میں عالم بقا کو راہی ہوئے۔''

کا مصنف سجان رائے دورِ عالمگیر سے تعلق رکھتا ہے اور یقیناً آپ کا ہم عصر ہی ہو گا۔ اسی دور کے ایک دوسرے مصنف بختیار نے اپنی کتاب ''مراۃ العالم'' میں یوں لکھا ہے۔

''بخدمت مخدومی (مجذوبی) سید، نام فائز

پرویدہ. از نوال و بهره و فی ایفت و از مشاهیر آفاق
پشت. فردو بزرگ سکنه پنجابرا باوطرفه اعتقادیست.
باوجود عدم اسباب دخل خرج بسیار داشت. مردم
کثیر مطیخ اووظیفه خوابووند. اقسام و حوش و طیور
پرد او جمع آمده فیل و شیرو شیرِ ببر و دیپر جانوران
فراهم آورده راتبه آنها داشت و عمارات عالی ساخته
و مابین لاهور و پجرات پُل طولانی بر نهر دیك
احدات نموده. درسی جلوسی انتقال نموده."

یہی عبارت بعینہٖ جناب محمد اسلم پسروری صاحب نے اپنی کتاب ''فرحت الناظرین'' میں نقل کی ہے۔ یہ کتاب شاہ عالم کے زمانہ حکمرانی میں تحریر ہوئی تھی۔ان روایات سے اس بات کو تو ضرور تقویت ملتی ہے کہ آپ کو سید ہی عام طور پر لوگ سمجھتے تھے۔مگر بالکل اسی طرح دو حوالہ جات اس کے بالکل ہی الٹ بھی ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں حوالہ جات آپ کے معاصرین ہی کے ہیں۔ان میں سے ایک تو عبداللہ خویشگی قصوری صاحب ہیں جنہوں نے ''معارج الولایت'' نامی کتاب میں یوں آپ کے بارے میں لکھا ہے۔

''مرید سیدنا سرمست است در اصل از قوم افغان
بوده............ و چون بوقت رفتن بجانب حسن ابدال
بخدمت اور سیده شده در مراقبه بود و قوالان مدح
خواجپان قدس الله ارواحهم می پفتند. چون سر از

مراقبہ برآورد یہ پیست پس از ساعتی کہ بافاقہ آمدہ و شیرینی بایں ضعیف می دادیعرض رسانیدہ کہ عنایت ظاهری را خواهاں نیست. هر چه عنایت شود ازنعماء اباطنی شود. تبسم فرمودہ ہفت ایں راهم بپیرد وآں راهم بپیرید که هر دو شمارا حاصل شود."

یہ کتاب فاضل مولف کے اپنے بیان کے مطابق 1094ھ میں لکھی گئی جبکہ حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کے وصال کو چھ سات برس گذر چکے تھے۔ اس میں اس بات کا تعین نہیں کیا گیا ہے کہ یہ ملاقات کب اور کس دور میں ہوئی اور نہ ہی اس بات کا ثبوت ہی فراہم کیا گیا ہے کہ آپ کس طرح افغان تھے۔

دوسرا حوالہ ہمیں جناب چراغ قادری صاحب کے اس رسالہ میں ملتا ہے جو کہ آپ نے حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

ایک دن عزت خان ولد سلطان شادماں گکھڑ نے شاہ دولہؒ صاحب سے التماس کی کہ حضور اپنے مبدا و منشا مبارک کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں۔ آپ ازراہ توجہ مہربانی (جو اس کے حال پر روا رکھا کرتے تھے)۔

قبول عرض کرتے ہوتے یوں گویا ہوئے کہ میری ماں کا نام نعمت خاتون ہے اور باپ کا نام عبدالرحیم عرف لودھی افغان ہے جو سلطان سکندر لودھی کے قوم و قبیلہ سے تھے اور یہ صورت یوں ہوئی کہ سلطان سلیم ولد شیر شاہ کی خلافت کے زمانہ میں جب سلطان سارنگ گکھڑ کے لئے اس بنا پر کہ وہ ہمایوں بادشاہ کی طرف داری کرتا تھا لشکر عظیم روانہ کیا تو بڑے جدال وقتال کے بعد سلطان سارنگ

شہید ہو گیا اور اس کے اہل قبیلہ میں بہت سے زن و فرزند افغانوں کے اسیر ہوئے تو غازی خان بن سلطان سارنگ خاں کی دودھ پیتی بیٹی ماں کی گود میں تھی۔

جب سلطان سارنگ کو زوال آیا اور اس کے بعد ہمایوں بادشاہ صرف ایک سال سر پر آرا ہو کر چل بسا تو اکبر بادشاہ کی خلافت کی نوبت آئی۔ نعمت خاتون اب جوان ہو چکی تھی۔ جسے عبدالرحیم نام افغان لودھی کے ساتھ بیاہ دیا گیا جو سپاہی تھا اور نوکر مقرب سرکار بادشاہی جلوس اکبر بادشاہ کے پچیسویں سال شیخ دولا نے اس کے بطن سے ولادت پائی۔ اور اسی سال باپ بیٹے کو یتیم کر گیا۔

اس رسالہ یا کتاب کے آخر میں قادری صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ''شیخ

هماں جادر موضع میانی ملا حاں کو ایك باغ درخت توت نشانده حضرت ایشاں است شب بزراینده صبحی جمله اهل زیارت را وداع کرده خود بدولت در کشتی نشته ایں روی آب بذشتند و ملا حاں را از نقدو اجناس بسیار انعام کرده و رخصت فرموده متوجه بجرات پردیدند. بوقت چاشت در موضع سوق که وطن مالوفه ایں داعی است تشریف آوردندد در مقبره متبرکه اسلاف بزرپوارایں احقر زیردرخست نشستند و فاتحه خوانده برزبان کرامت ترجمان راندندکه اے سروبوستان خلوت کده وصال و سرمستان باده احوال ایں وقت انفصال ماه شماو برزبان آورده امیدواریم که دراندك ایام بجمال ایك دپر خورسند شویم.

مردم دیهه ازرؤ ساو رعایا و هندو بازاری همه بزیارت دویدندو دامن دامن وامن نقودو شیرینی و لشکر و میوه بنذر پزرا یند ند. برهمه کس ازیکی بدیپیری بخشش شد. زاں جمله زاں جمله ایں فدوی قربان صاحبدلاں مقدار دو پهڑی فیض یاب حضور بود. مقدار ایك پشتاره شکرو شیرینی بحه فقیر آمده باشد: بعد ازاں روانه پجرات شد ندو پنج روز پجرات شد ندو پنج روز بصحت و سلامت ماند ند.

روز ششم ناپاه آزا رتب و اطلاق بحضرت ایشاں در پرفت و سیزده روز بایں اطلاق مبتلا بودند. حکمای و اطبایحاذق هر چند ترکیب و معجون وسیله سعادت خود کرده می آوردند هرپز قبول نمی افتاومی فرمودند که دولاوصال دوست می خواهد و ایں مردم ناداں سبب انفصال می طلبندو تردد زندپانی می کنند و می دانند که .... زنده آنست که بادوست وصالی وارد. دریں اثنا بهاون که بعضی او را فرزند حقیقی می نامندو بعضی متبنی می پویند عرض کرد که تبرك بمن عنایت شود. فرمودند که اے بهاون تو دولارا اراضی نکنی مولاراچپونه راضی خواهی داشت و آنپلیم منست خواه تونپهدار خواه دیپری.

مــعــزرا هــمــراه خــود بــرداشــتــم
استــخــواں بــرســپــاں بــپــذاشــتــم

اما ایں قدر وصیت می کنم که اِبر برتربت دولا مجاوری خواهی کرد هر که از هندوستان و خراسان بایں راه خواهد پذشت البته یك چیتل بر خاك خاکسار خواهد پذاشت. برائے معیشت توغماں کافی خواهد بودو کمی و غمیرزق نخواهی دید.

قادری صاحب کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کو حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کی قربت نصیب ہوئی تھی۔

حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والوں کو سلطان سارنگ کے بارے میں بھی جاننے کا ضرور اشتیاق ہوگا چنانچہ مناسب ہے کہ اس بارے میں بھی کچھ تحریر ملاحظہ ہو۔ اس سلسلہ میں ہمیں بہترین مواد کیگوہرنامہ میں ملتا ہے جس کو رائے زادہ جیوان دُنی چند نے 1137ھ میں تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور نے باہتمام محترم ڈاکٹر محمد باقر صاحب 1965ء میں شائع کیا تھا۔ رائے زادہ صاحب نے تحریر کیا کہ۔

سلطان ہاتھی کی وفات کے بعد گکھڑوں کی سلطانی اور سرداری سارنگ کوملی اور سکندر لودھی کے زمانہ اورنگ نشینی میں جس کی وفات کے بعد ابراہیم لودھی سر پر آرا ہوا تو دولت خاں کی استدعا پر بابر نے لشکر کشی کی ۔اسی لشکر کشی کے دوران جب وہ پانچویں مرتبہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو سلطان سارنگ اور سلطان آدم کو بلوا بھیجا (یہ اس دور میں کسی کے وفادار ہونے یا نہ ہونے کی آزمائش کا طریقہ تھا۔اور جب انہوں نے حاضر ہونے میں کسی تذبذب کا اظہار نہ کیا تو بابر نے نہ صرف یہ کہ ان کو شریک طعام کیا بلکہ وہ پوستین بھی سارنگ کو

مرحمت کو جوزیب بدن تھی اور اسے پانا بھائی کہا۔اور دونوں بھائیوں نے کئے گئے عہد کو زندگی بھر نباہا۔اس وقت بھی جب ہمایوں کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا۔یہ مغل دوستی بھی شیر شاہ اور اس کے بیٹے اسلام شاہ کے گکھڑوں کے ساتھ محاربے اور معرکے جارے رکھنے کی ایک وجہ تھی جو سات سال تک طول پکڑ گئے۔

انہیں معرکوں میں جب قتال و جدال کے شعلے بھڑک رہے تھے سلطان سارنگ اور آدم خاں نے منزل نامی ایک پہاڑی پر ڈیرہ ڈال دیا اور اپنے بیٹے کمال خاں کو اول الذکر نے افغانوں کے پاس مصالحتی ملاقات کے لیے بھیجا جسے انہوں نے بدعہدی کرتے ہوئے گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔اس کے بعد متعدد جھڑپوں اور پنجہ آزمائیوں کے نتیجہ میں ۹۵۳ھ کو (جو اسلام شاہ کا جلوس بھی تھا ) سلطان سارنگ اپنے سولہ بیٹوں کے ساتھ کارزار میں کام آیا اس کی کھال اتروکر افغانوں نے روہتاس کے دروازہ پر لٹکوادی اور آدم خاں اس کا جانشین ہوا۔

رائے زادہ کے مطابق سارنگ کے زندہ بیٹوں میں کمال خاں تو قید افغاناں میں تھا۔الاول (علاول ) خاں شاہ مونگا کا مرید (یعنی شاہ دولہؒ صاحب کے مرشد شاہ سیدا کا پیر بھائی )لباس فقیری پہن کر اس عرصہ دار دگیر سے کنارہ کر گیا تھا۔ہاں سید خاں نیز غازی خاں' ابدال خاں اور عزیز خاں سلطان آدم کے جنگ وجدل کے ساتھی رہے۔

انہیں ایام میں کسی نے اڑادی کہ الاول خاں راہی ملک عدم ہو گیا ہے۔چنانچہ اس کی بیوہ کو آدم خاں کا بیٹا لشکر خاں اپنے حق نکاح میں لے آیا۔لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزارا تھا کہ الاول خاں چند فقیروں کے ہمراہ اسی فقیری لباس میں وطن کو لوٹا۔علاقے کے زن ومردان کی زیارت کو آنے لگے۔ان زیارتوں

میں الاول خاں کی بیوی بھی تھی جس نے اسے پہچان لیا اور گھر جا کر لشکر خاں کو بتلا بھی دیا۔

فتنے کے بھڑک اٹھنے کے امکان کو ختم کرنے کے لیے لشکر خاں نے یہی چارہ کار سوچا کہ الاول کو ختم کر دیا جائے۔

لیکن موضع ہوتھلہ کے ایک کمہار نے جو اپنے آپ کو سارنگالوں کا نمک خوار گردانتا تھا قبر میں سے الاول کا ہاتھ کاٹ کر اسے گرم تیل میں جوش دینے کے بعد کمال خاں کے پاس دہلی بھیج دیا۔ کمال خاں نے دیکھتے ہی سر پیٹ لیا اور انتقام کے لیے وقت کا منتظر رہا۔ اور آخر ۹۷۰ھ میں تخت دہلی کی پشت پناہی سے وہ سلطان آدم اور اس کے بیٹے لشکر خاں کو زندہ گرفتار کر کے پوٹھوہار پر قابض ہو گیا۔ اس کا دور اقتدار ۹۷۶ھ تک رہا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ممارا خاں خطاب سلطانی اور منصب پنج ہزاری سے نوازا گیا اور جب آگے چل کر اکبر بادشاہ نے پوٹھور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تو پرگنہ دانگلی سلطان جلال خاں کو دیا گیا جو سلطان آدم کا پوتا تھا۔ پرگنہ پھروالہ ممارا خاں کے پاس رہنے دیا۔ پرگنہ پنڈی سید خاں کو ملا اور پرگنہ اکبر آباد شیخ کہکار بدھال کو مرحمت ہوا۔ ممارا خاں کی وفات ۹۷۹ھ میں ہوئی تو اس کا پرگنہ بھی جلال خاں کو مرحمت کر دیا گیا جو افغانوں کے ہاتھوں ایک معرکہ کے اندر ۱۰۲۸ھ میں مارا گیا۔

اب اکبر نامہ کی طرف آیئے جو شیر شاہ کے دور کے بہت بعد نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں سارنگ کا ذکر کرتے ہوئے درج ہے کہ سارنگ کے شیر شاہ اور سلیم شاہ سے بہت معرکے ہوئے اور اس نے افغانوں کی خاصی تعداد کو بندیوان بنا کر

فروخت کیا۔ روہتاس کا قلعہ شیر شاہ نے ان کے سد باب کے لیے ہی تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ انجام کار شیر شاہ نے سلطان سارنگ کو دستگیر کیا اور مار ڈالا۔ جب کے اس کے بیٹے کو گوالیار میں قید کر ڈالا۔

جہاں سے معجزانہ طور پر بچ جانے کے بعد وہ اپنے بھائی سید خاں کے ساتھ گمنامی کی زندگی گزارنے لگا کیونکہ سلطان آدم نے تمام اختیارات سنبھال لیے اور وہ سردست اپنے چچا کے ساتھ پنجہ آزمائی نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس وقت کا انتظر رہا جو بالا آخر آہی گیا۔ کمال خاں کا بیٹا تیسویں سال جلوس اکبری تک اکبر نامہ کی رو سے کشمیر میں ملازم شاہی رہا۔ آئین اکبری میں یہ بھی درج ہے کہ سید خاں کی ایک بیٹی شہزادہ سلیم سے بیاہی گئی تھی۔

یہ اقدام غالباً شبہ کے ازالہ کے لیے تھا جس کی طرف اکبر نامہ میں تحریر ہے کہ پسران سارنگ کمال خاں وسید خاں گکھڑ متابعتی بنفاق می کردند۔" تاریخ شیر شاہی میں آیا ہے کہ شیر شاہ نے جب پنجاب پر قبضہ کرلیا اور دریائے چناب پر پہنچا تو دستور کے مطابق سارنگ اسے ملنے کو نہ آیا۔ چنانچہ شیر شاہ تمام قوت کے ساتھ پدمان اور گھر جاکھ کی پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا اور قلعہ کے لیے موزوں جگہ جانچتا ہوا آگے بڑا۔ آخر روہتاس والے مقام کو موزوں جان کر وہاں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ گکھڑوں کو تہس نہس کیا۔ اسیر کیا اور خود سارنگ کی بیٹی کو گرفتار کر کے خواص خاں کے حوالے کر دیا۔

تاریخ داؤدی کا مصنف رقمطراز ہے کہ اسلام شاہ سلطان آدم گکھڑ کو گرفتار کرنا چاہتا تھا جس میں وہ کامیاب نہ ہوسکا لیکن اس نے سارنگ گکھڑ کو ضرور گرفتار کرلیا اس کی کھال ادھیڑنے کا حکم دیا اور کمال خاں کو قید کر دیا۔ تاریخ

خاں جہاں لودھی میں درج ہے کہ شیر شاہ نے روہتاس کا قلعہ مغلوں کی آمد کا سد باب کرنے کے لیے تعمیر کرنا چاہا۔ رائے سارنگ کے خلاف لشکر بھیجا اور نہ صرف اس علاقہ کو مفتوح کیا اور بالناتھ کے ٹلہ کو بھی جہاں اس علاقہ کا داروغہ رہتا تھا بلکہ اس کے سردار کی بیٹی کو قید کر لیا اسے شیر شاہ کے سامنے لایا گیا جس نے اسے خواص خاں کو دے دیا۔

طبقات اکبری میں آیا ہے کہ بڑی جدوجہد کے بعد شیر خاں سارنگ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کی کھال ادھیڑنے کا حکم دیا گیا اور کمال خاں کو گوالیاء میں قید کر دیا گیا۔ شیر خاں کے بعد سلیم خاں نے باپ کی روش اختیار رکھی اور گکھڑوں پر یلغاریں کیں۔ بہتوں کو گرفتار کر کے جب گوالیار لایا گیا تو حکم دیا گیا کہ سب کو ایک کمرے میں بند کر کے اس میں بارود بھر دیا جائے اور آگ لگا دی جائے کہتے ہیں کہ ایسا ہی کیا گیا لیکن کمال خاںؒ معجزانہ طور پر بچ گیا جس پر سلیم خاں نے اسے بلایا اور وفاداری پر آمادہ کرتے ہوئے حاکم پنجاب کے ساتھ مل کر کام کرنے کو کہا تا کہ گکھڑوں کا علاقہ زیر کیا جا سکے جسے کمال خاں نے قبول کر لیا۔

بعد میں جب ہندوستان پھر مغلوں کے زیر نگیں ہوا تو کمال خاں نے اجداد کی روایت کو نبا ہا۔ اسے جاگیر مرحمت ہوئی۔ یہاں تک کہ جب سلیم خاں کے بیٹے شیر خاں نے علی قلی خاں پر حملہ کیا تو خاں کو اس خاں کو اس کی مدد کے لیے ہدایت کی گئی جس میں اس نے اس جرات اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا کہ اسے کہا گیا کہ جو مانگنا چاہے مانگ لے۔ کمال خاں نے وطن کی محبت کے زیر اثر التجا کی کہ اسے اس کا آبائی علاقہ دے دیا جائے۔ چنانچہ حکم صادر ہو گیا کہ اس علاقہ میں سے جو پہلے سارنگ کے پاس تھا اور اب آدم کے پاس ہے نصف کمال کو دے دیا جائے۔

ادھر حاکم پنجاب کو ہدایت کی گئی کہ سلطان آدم انکار کرے تو سارا علاقہ اس سے لے کر کمال کو دے دیا جائے۔آدم کے انکار پر ایسا ہی کیا گیا۔لڑائی کی نوبت آئی جس میں آدم کو شکست ہوئی اور وہ دستگیر ہوا۔اس کا بیٹا وقتی طور پر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن بعد میں گرفتار کر لیا گیا اور دونوں کو کمال خاں کے حوالے کر دیا گیا۔آدم خاں کمال خاں کے پاس ہی رہا تا آنکہ داعی اجل آ گیا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی روایت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے کہ حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ سلطان سارنگ کی پوتی تھیں۔اگر اس بات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو یہ کس قدر حیران کن بات ہے کہ ان کو اسی قدر بے بسی کی تصویر بننا پڑا جبکہ سارنگ سلطان کے اخلاف تو گیارھویں صدی ہجری کے آخر تک مغلوں کے قابل قدر اور قابل اعتما ساتھی شمار ہوتے تھے اور اس علاقہ میں انہی کی اجارہ داری تھی۔

پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی ایک خاتون اس قدر بے آسرہ اور اس قدر بے سروسامانی کا شکار ہو جائے کہ وہ انہی کے علاقہ میں چکی پیستی رہے اور ان کو خبر بھی نہ ہو رہی نہیں بلکہ ہمیں تو یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ ماں کی وفات کے بعد شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمۃ نے بھیک مانگ کر گزارا کیا تا آنکہ آپ کو ایک ہندو نے خرید لیا۔

دوسری بات یہ بھی بڑی حیران کن ہے کہ جب مغل حکمرانوں کا دور واپس آیا تو لودھی خاندان کے لوگوں نے اپنے عزیز یعنی عبدالرحیم لودھی کی واحد نشانی کو کیوں تلاش نہیں کیا جبکہ یہ بات اس دور میں بہت ہی اہمیت کی حامل قرار دی جاتی تھی۔

# حضرت شاہ دولہؒ گجرات میں

جناب پروفیسر شریف کنجاھی صاحب حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ کے گجرات میں آنے کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ یہ نقل مکانی ۱۰۲۲ھ میں ہوئی جو بعید از قیاس نہیں ہے کہ سیدا سرمست کا وصال ۱۰۱۵ھ میں بتایا جاتا ہے۔کرامت ناموں اور تذکروں میں بھی سیالکوٹ سے زیادہ گجرات ہی کا ذکر ملتا ہے شاید اس لیے کہ سیالکوٹ کے مقابلے میں گجرات اس شاہراہ اعظم پر واقعہ تھا جو اس برصغیر کے لیے مشرق وسطیٰ سے رابطے کی سڑک تھی۔پھر جلال الدین اکبر کے وقت قلعہ کی تعمیر اور گجرات کی آبادی نے بھی اس جگہ کی اہمت بڑھا دی اور سیالکوٹ میں حالات کو سازگار نہ پاتے ہوئے آپ اسی راستے جناب کو پار کر کے اس کے دوسرے کنادے پر اقامت گزین ہو گئے۔

جس پر چراغ قادری کے کہنے کے مطابق آپ اپنے وصال سے چند روز پہلے سیالکوٹ سے تشریف لائے تھے۔شاہان مغلیہ میں سے اس وقت جہانگیر کا دور حکومت تھا مغل تقریباً سارے کے سارے ہی اہل اللہ کے عقیدت مند تھے۔اکبر کی حضرت سلیم چشتی سے ارادت اس کی زندگی کا منفرد عنوان ہے۔اسی طرح جہانگیر بھی حضرت احمد سرہندیؒ کے ساتھ اختلافات کو استثنائی صورت سمجھیں تو ان لوگوں کا معتقد ہی تھا اور تزک جہانگیری میں اس عقیدت کی مہک جگہ جگہ ملتی ہے۔اور اس نے بعض کی زیارت بھی کی لیکن گجرات میں سے گزرنے کی باوجود تزک جہانگیری اور دوسرے معاصر تذکرے شاہ دولہؒ صاحب کے ساتھ آپ کی ملاقات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔

کرامت نامہ مشتاق رام میں دونوں کی ملاقات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس کو کسی طرح بھی قابل یقین نہیں کہا جا سکتا کہ جہانگیر شاہدرہ کے قریب شکار کو آیا ہو اور شاہ دولہؒ صاحب کا ایک ٹوپی پوش، ہرن گجرات سے دہاں تک چلا جائے۔ کسی ہرن کے لیے یہ فاصلہ بلاشبہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن بات قابل غور یہ ہے کہ شاہ دولہؒ چناب کے دوسرے کنارے رہتے تھے اور ہرنوں کو تیراک جانوروں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ جہانگیر کے بیٹوں میں سے خسرو ممکن ہے اگر چناب پار کر لیتا تو سکھوں کے گروار جن کی طرح شاہ دولہؒ صاحب کو کسی آزمائش سے دو چار کر جاتا۔ باقی بیٹوں میں سے کسی کو ہم شہزادگی کے دور میں ادھر آتے نہیں دیکھتے۔اور یوں پہلے دو شہنشاہوں کے دور کو ہم شاہ دولہؒ صاحب کے حوالے سے خالی پاتے ہیں لیکن چوں کہ کرامت ناموں میں جہانگیری دور کے بعض اُمراء کے نام آتے ہیں،۔اس لیے ان سے متعلق داستانوں کے معاملہ میں ردو قبول کا اختیار رکھتے ہوئے بھی یہ مانا جا سکتا ہے کہ دربار و عہد جہانگیری کے سربرآوردہ لوگوں کا شاہ دولہؒ صاحب کے پاس آنا جانا ضرور ہوگا۔

شاہ جہاں کے تخت نشین ہونے کے بعد سے البتہ شاہ دولہؒ صاحب کا نام تذکروں میں زیادہ آنے لگا تھا۔لیکن اس دور میں بھی کسی وقائع نگار نے ہلکا سا اشارہ تک نہیں کیا کہ شاہ جہاں کی گجرات سے گزرتے ہوئے شاہ دولہؒ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔حالانکہ شاہ جہاں نامہ کے مطابق ۱۰۴۳ھ میں کشمیر سے واپسی پر گجرات کے قریب جب اس نے ڈیرا ڈالا تو شہر کے سادات و مشائخ اسے ملنے گئے تھے یہ ضرور ہے کہ داراشکوہ قندھار جاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جیسا کہ اس کی چہیتی بہن جہاں آرا کی تحریر' صاحبیہ میں مرقوم ہے جہاں

آرا نے خود بھی گجرات پہنچ کر نذر بھیجی اور سکون دلی کی طالب ہوئی۔

لیکن سرکاری اور نیم سرکاری وقائع نگار اس معاملہ میں خاموش ہیں شاید اس لیے کہ اورنگ زیب کے عالم شاہزادگی میں راجوری کے راجہ کی بیٹی سے بیاہے جانے کے بعد جو شاہ دولہؒ صاحب سے عقیدت رکھنے والا خاندان تھا دارا شکوہ آپ سے جذباتی طور پر دور ہوتا چلا گیا ہو۔ وقت اور حالات نے اس فاصلہ کو اور زیادہ کر دیا۔ اور شاہ جہاں کے چہیتے بیٹے کے مزاج کو پاتے ہوئے وقائع نگاروں نے بھی سرکاری ملازموں والی روش اختیار کر لی ہو۔ یا اس کو زیادہ اہمیت نہ دی ہو۔

اسی بنا پر اس روایت کی صحت تاریخی لحاظ سے مشکوک نظر نہیں آتی جس کا ذکر ایلیٹ نے کیا ہے اور جس کے مطابق اورنگ زیب نے یہ جاننے کے لیے کہ بھائیوں میں سے تخت کا وارث کون ہوگا حاضر ہو کر ایک مرغ زریں، ایک بلی اور ایک عصا پیش کیا۔ اپنے ذہن میں یہ بات رکھتے ہوئے کہ اگر عصا لوٹا دیا گیا تو یہ نیک فال ہوگی۔ خوبی قسمت کہ شاہ صاحب نے ایسا ہی کیا اور آنے والے ایام نے بھی اسی کی تصدیق کر دی۔ ادھر دارا شکوہ کا سفینتہ الاولیاء اور سکینتہ الاولیاء میں آپ کا ذکر نہ کرنا بھی اسی داخلی ناخوشی کی غمازی کرتا ہے کیونکہ ایک روایت کے مطابق دارا شکوہ نے بھی آپ سے اس عقدہ کی خوش آیند کشود چاہی تھی لیکن مایوسی ہوئی۔ چراغ قادری کی تالیف کے آخر میں تخت نشینی کی یہ بات میرے نانا جی کے حوالے سے شاہ جہاں سے منسوب ملتی ہے جس کے جواب میں شاہ دولہؒ صاحب نے فرمایا کہ صبح جواب ملے گا اور صبح کو یہ اشعار فرمائے۔

فجری ویلے اُٹھ کے جا کیتی عرض درگاہ نوں

سجدے تے سر رکھیا اس ڈاہڈے بے پرواہ نوں
ملک خزانہ ہندا کہو کس نوں کراں اگانھ نوں
سب ملائک آکھدے بادشاہی رنگوشاہ نوں

اس ضمن میں اس طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہو گا کہ اورنگ زیب ۱۰۴۹ھ میں کنار چناب آکر باپ کو ملا تھا اور ممکن ہے گجرات جا کر اس نے شاہ دولہؒ صاحب سے ملاقات بھی کی ہو اور آپ نے کوئی حوصلہ افزا بات کہی ہو یا شاہ جہاں کے استفسار کا جواب ہی محل شاہی میں راز نہ رہ سکا ہو کیوں کہ انہیں ایام میں جہاں آرا اور داراشکوہ بھی آپ سے ''صاحبیہ'' ہی کے مطابق استمداد کے طالب ہو چکے تھے یا کم سے کم حاضر خدمت ہو کر گویا آپ کے مقام و مرتبہ کے اعتراف کر چکے تھے ۔ یوں سکینتہ الاولیاء میں جسے ۱۰۵۲ھ میں لکھا گیا داراشکوہ کا آپ کو خارج از اوراق ٹھہرانا خود ہی گواہ بنتا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا اور اپنی ساری خوبیوں کے باوجود ہم دارا کو بشری خامیوں سے خالی تو نہیں کہہ سکتے ۔

تاریخی شواہد بہر حال آپ کو عہد شاہ جہانی کی ایک قابل احترام شخصیت بتاتے ہیں جیسا کہ عبداللہ خویشگی کی آپ سے ملاقات ظاہر کرتی ہے جو ۱۰۶۶ھ کے بعد ہی کسی وقت ہوئی ہو گی ۔ اسی طرح مآثر الامرا میں مبارز خان کے ضمن میں یہ اشارہ کہ آپ صاحب کرامت درویش تھے اور یہ بات بھی مبارز خان کو ایام طفلی میں اپنی والدہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب سعادت نصیب ہوئی تھی آپ کو ایک معروف صاحب حال درویش کی حیثیت شاہ جہانی دور میں ہونے کی تصدیق کرتی ہے ۔

کیوں کہ مبارز خان کا عہد طفلی شاہ جہاں کی فرمانروائی کے ربع اول سے

مطابقت رکھتا ہے۔لیکن جب یہ دیکھ جائے کہ آپ کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی جب اورنگ زیب کو تخت نشین ہوئے سترہ سال گزر چکے تھے اور شاہ جہاں نے تیس سال حکومت کی تھی تو شاہ دولہؒ صاحب جہانگیری دور میں چلے جاتے ہیں بلکہ اگر جہانگیر کے بائیس سال کو بھی شامل کرلیں تو کل ۷۰ سال بنتے ہیں جس سے زیادہ عمر پانا ممکن یا غیر معمولی امر نہیں ہے۔اسی طرح اگر اکبر کا نصف دور بھی شامل کرلیا جائے جو ۲۵ سال بنتا ہے تو پچانویں سال کی عمر غیر معمولی سہی خارج ازامکان نہیں ہے اور بغیر کسی مصدقہ تاریخی حوالہ کے بھی شاہ دولہؒ صاحب کو مغل فرماؤں کے پورے دور عروج کی شخصیت ماننا پڑتا ہے۔

اگرچہ ذہن کو اس طرف بھی لانا پڑتا ہے کہ اگر آپ کے حالات زندگی کا انداز وہی تھا جس کی مہک بعض تذکرہ نگاروں نے دکھائی ہے تو اس عالم کسمپرسی میں آپ نے دینی یا دنیوی تعلیم حاصل نہیں کی ہوگئی یا باقاعدہ طور پر کسی کے آگے زانوئے ادب تہ نہیں کیا ہوگا۔یہ اور بات ہے کہ قدرت نے اس کی تلافی کرتے ہوئے آپ کو اس راہ پر ڈال دیا جہاں لغت ہائے حجازی کی قارونی کسی کام نہیں آتی کہ ؎

دفتر صوفی سوا دوحرف نیست
جز دل اسپید مثل برف نیست

اور جب تک ابتدائی ایام کے بارے میں کوئی قابل اعتماد حوالہ نہیں مل جاتا اس وقت تک ہمارے لیے یہ مان لیے بغیر کوئی بظاہر چارہ نہیں کہ علوم متداولہ کی تحصیل شاہ دولہؒ صاحب نہیں کر سکے تھے۔کرامت نامہ مشتاق رام کی چند سطریں بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ''روزے مولوی محمد حکیم پر سید کہ شاہ دولہؒ من در خواندن علم تحصیل ساختہ ازراہ خدا ہیچ

معلوم نشد .تو کہ درراھش قدم نهادی از چه سبب و چونه . مرا راست بہور هدایت کن .فرمودند که بهائو تو از عنایات ایزدی تمام علمت حاصل کرده فاضل و دانش مند ہشتی و بادشاه زمین و زمان امام تمازت ساختند و فقیر عاجز اُمی راخدائے تعالی بسوئے خود کشید ......

لیکن مشتاق رام اور چراغ قادری کی کتنی ہی باتیں چونکہ بے وزن سی ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم ابتدائی زندگی کے متعلق جو کچھ انہوں نے بتایا ہے اسے حرف آخر مانیں ۔خاص طور پر جب سیر السلوک ان کی تصنیف کے طور پر سامنے آگئی ہے اور اگر یہ وہی شاہ دولہؒ گجراتی ہیں پھر ہمیں آپ کی زندگی کے بارے میں فردا کی نگاہیں رکھنی چاہیں کہ شاید کل کوئی اور قلمی کتاب منظر عام پر آ کر بعض عقدوں کو وا کر جائے ۔

سیر السلوک کے سرورق پر آپ کے قادری طریقہ سے وابستہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے جب کہ بیشتر ارباب قلم نے آپ کو سہروردی سلسلہ سے منسلک بتایا ہے۔ غالباً سلیم التواریخ میں شاہ سید اسرمستؒ کو سہروردی لکھنے کے باعث ۔صاحب سلیم التواریخ نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ شاہ سیدؒ میں سہروردی سلسلہ کی کون سی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر ان کو سہروردی کہنا چاہیے اور کس معاصر حوالے کے سہارے۔اسی طرح شاہ دولہؒ صاحب کی معلوم زندگی میں اس سلسلہ کی جھلک کہاں تک نمایاں ہے اور وہ جھلک کیا ہے۔

یہ سوال اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ کسی عصری حوالے نے آپ کو کسی سلسلہ سے وابستہ نہیں بتایا ہے ۔احوال العارفین میں آپ کو سہروردی قادری بتایا گیا ہے

۔ مقامات محمود میں آپ کو سلسلہ قادریہ میں دکھایا گیا ہے اور ان کے حوالہ سے قاضی سلطان محمود صاحب کو بھی (ص ۳۹۴) چراغ کا اپنے آپ کو قادری لکھنا اور اپنے باپ مراد کو شاہ دولہؒ صاحب کے حلقہ نشینوں میں شمار کرنا بھی آپ کے سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہونے کی دلیل بنتا ہے ۔اس معاملہ میں بہر حال مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔اگرچہ عرفانی لحاظ سے یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے کہ کوئی عارف کس سلسلہ عرفان سے تعلق رکھتا ہے سب سلسلے بالآخر ایک ہی سمت کو جاتے ہیں اور ایک ہی مقام تک پہنچنے کی کوششیں ہیں اور آپ جس بھی طریق تصوف پر گامزن تھے لوگوں کو قبول تھے اور ان میں مقبول تھے ۔نیز ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بعض صوفیاء نے ایک سے زیادہ سلسلوں میں بیعت کی ۔سرزمین گجرات کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے شاہ دولہؒ نے شرف قبولیت بخشا ۔ورنہ سیالکوٹ سے وہ کسی جگہ بھی اور کسی طرف کو بھی جا سکتے تھے ۔اور جہاں بھی جاتے اسی طرح محبوب دلہا ہوتے لیکن جس صحت کو اس نے بقعہ نور کیا وہ اس پر جس قدر ناز کرلے کم ہے اور یہ نسبت کم نہیں ہے کہ گجرات کو معاصرین اور متاخرین نے گجرات شاہ دولہ کہا ہے۔

# بیعتِ مُرشد

حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ پیدا ہوتے ہی سائیہ پدری سے محروم ہو گئے تھے اور اب آپ کی واحد کفیل آپ کی والدہ ماجدہ تھیں ۔اس ضمن میں جناب چراغ قادری صاحب نے کرامت نامہ میں تحریر فرمایا کہ۔

خاوند کے سر سے اُٹھ جانے کے بعد نعمت خاتون نے چونکہ اپنی والدہ سے سن رکھا تھا کہ وہ پوٹھوہار کے رہنے والے ہیں اس لیے بیوہ وبیکس و عاجز ہندوستان سے بے ٹھکانہ ہو کر پوٹھوہار کو چل دی ۔لیکن چوں کہ سلطان سارنگ کو مرے مدت گزر چکی تھی اس لیے کسی نے اس کو نہ پہچانا اور خوش آمدید نہ کہا۔چنانچہ اس نے پانچ سال موضع سہالہ میں گزارے جو پرگنہ پھروالہ کا ایک گاؤں تھا ۔وہاں محنت مزدوری کر کے دن کاٹے اور پھر موضع کالا میں چلی گئی جو پرگنہ روہتاس میں تھا۔یہاں چار سال چکی پیس کر اس نے اپنا اور بیٹے کا پیٹ پالا اور یہاں ہی اپنی متاع حیات موت کے حوالے کر دی۔

شیخ اب طفل یتیم وبیکس رہ گئے اور دریوزہ گری کرتے ہوئے قصبہ نخی سیالکوٹ میں جا پہنچے ۔وہاں قانون گوؤں میں ایک کارندہ مہتہ کیماں دولت مند اور بامروت آدمی تھا۔اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی ۔شیخ کے طور طریقے اسے پسند آئے تو یتیمی وبیکسی پر ترس کھاتے ہوئے شیخ کو اس نے متبنٰی بنالیا اور بڑی ناز و نعمت سے تربیت کرنے لگا ۔شیخ جوان ہوئے تو آثار بزرگی پیشانی سے ہویدا

ہونے لگے ۔ قانون گوؤں نے آپ کی دانش اور کا گذاری کو دیکھتے ہوئے کیماں سے آپ کو لے لیا اور توشکخانہ کی ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی۔

اس وقت بھی آپ کشادہ دلی اس حد تک تھی کہ ردِ سوال آپ سے ممکن ہی نہیں تھا اور جو کچھ پاس ہوتا آپ راہ خدا میں خرچ کر دیتے ۔ پھر چونکہ سخی کے ہاتھ میں زر اور چھلنی میں پانی نہیں رہ سکتا تھوڑے ہی عرصہ میں توشک خانہ کا سارا مال اسباب سائلوں کی نذر ہو گیا ۔ قانون گویوں کو پتہ چلا تو انہوں نے شیخ کو قید کیا اور طرح طرح کی اذیتیں دیں ۔ جب آپ بہت عاجز آئے اور جانا کے سوائے مرگ کے چارہ نہیں ہے تو قانون گویوں کو کہا کہ متاع جنس تو مجھ سے خرچ ہو گئی ہے لیکن نقدی محفوظ ہے اور اسی توشہ خانہ میں مدفون ہے ۔

اگر آپ مجھے آزاد کر کے وہاں لے جائیں تو میں وہ دفینہ نکال کر دے سکتا ہوں ۔ انہوں نے ایسا ہی کیا ۔ شیخ جب توشہ خانہ میں گئے تو چھری لے کر اپنے پیٹ میں گھونپ دی ۔ قانون گویوں نے خیال کیا کہ اس حادثہ کا ان پر اُلٹا اثر پڑے گا اور ارباب عدالت سے کہیں باز پرس نہ ہو جائے ۔ چنانچہ آپ کے علاج معالجہ میں لگ گئے ۔ تین ماہ میں اندماں زخم ہوا تو قانون گویوں نے آپ کو آزاد کر کے سمجھا ستے چھوٹے چونکہ حصوں سعادت کا وقت قریب آ چکا تھا اس لیے قریب کے گاؤں "سہکوتی پرہ" میں شاہ سیدا سرمستؒ کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔"

# تصوف اور اسلام

ابھی آپ نے جو طرز عمل حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کا ملاحظہ فرمایا وہ یقیناً ایک صوفی باصفا ہی کا طرز عمل ہو سکتا ہے ۔ اگرچہ ہمیں یہ بتلایا جاتا ہے کہ

آپ نے اپنی زندگی کی ابتداء انتہائی کسمپرسی میں کی اور آخرِ کار آپ کو ایک ہند
رئیس اپنا لے پالک بنا کر لے گیا۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پھر آپ ک
قانون گویوں کے حوالہ بھی کر دیا گیا جہاں وہ لوگ آپ کے ساتھ ناروا سلوک بھی
کرتے رہے۔

قانون گویوں کی اصطلاح عام طور پر پٹوار خانوں میں مستعمل ہوتی
ہے۔ یہاں اس فقیر کا خیال ہے کہ آپ کو ان لوگوں کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا
ہوگا جو گوداموں میں مال وغیرہ رکھتے تھے اور بظاہر اس ہندو رئیس کے با اعتماد لوگ
تھے۔ انہی کی بداعمالیوں کی وجہ سے ہی آپ نے گجرات کو خیر باد کہہ کر مرشدِ کامل
کی تلاش کی ہوگی۔ جو کہ آپ کو حضرت شاہ سیدا سرمست کی صورت میں مل گئی۔

دراصل یہ سب کچھ جو ہم اولیائے کاملین کی زندگیوں میں اتار چڑھاؤ
دیکھتے ہیں۔ یہ ہماری یعنی صدیوں بعد آنے والی نسلوں کے لئے سامانِ تربیت ہوا
کرتا ہے۔ ہم آئندہ اوراق میں آپ خدمتِ اقدس میں تصوف کے بارہ میں اہل
اسلام اور ہندوؤں کے فلسفہء تصوف کو پیش کریں گے جس سے یہ بات ثابت ہوئی
ہے کہ تصوف کی بنیاد درحقیقت ایک خدا پرستش اور عام لوگوں کی فلاح و بہبود سے
ہی عبارت ہے۔ جیسا کہ ہمیں خلافتِ راشدہ میں حضرتِ شیخین رضوان اللہ علیہم
اجمعین کے احکامات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے اپنی افواج کے کمانڈروں
سے فرمایا۔ تھا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے تعرض مت کرنا اور ان لوگوں سے
بھی درگذر کرنا جو دنیا ترک کر چکے ہیں اور اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

آیئے ملاحظہ فرمایئے کہ جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب اپنی معرکتہالاراء کتاب تاریخ تصوف میں کس طرح فلسفہء تصوف کو اسلام اور ہندوازم میں پیش فرماتے ہیں۔

## بیعتِ مرشد

یہ طریق قرآن اور سنت دونوں سے ثابت ہے:

''اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط'' (۴۸۔۱۰)

بلاشبہ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ (پیمان وفا باندھتے ہیں)

''لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ'' (۴۸:۱۸)

بے شک اللہ راضی ہو گیا ان مؤمنوں سے جس وقت وہ بیعت کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس درخت کے نیچے۔

## صحبتِ مرشد

اگر تزکیہ نفس محض کتابوں سے ہوسکتا تو اللہ تعالی بعثت انبیاءؑ کا سلسلہ جاری نہ فرماتا۔ اپنی کتاب کسی شخص کی معرفت دنیا والوں کے پاس بھیج دیا کرتا۔ پس جس طرح صحابہ کرامؓ نے رسول خدا سرکار دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اپنے نفوس کا تزکیہ کیا۔ اسی طرح آئندہ نسلوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر زمانے میں ایسے خاصانِ خدا پیدا ہوتے رہیں جو فنا فی الرسول ہو کر تزکیہ نفوس کا مقدس فریضہ انجام دے سکیں۔

وجہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس کا علم نہ کتابوں میں مذکور ہے اور نہ کتابوں کو پڑھ کر کوئی شخص تزکیہ کر سکتا ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ اگر چہ فن طبابت اور فن جراحت کا علم کتابوں میں مذکور ہے۔مگر آج تک جالینوس کے زمانہ سے لے کر آج تک کوئی حکیم یا طبیب یا ڈاکٹر یا سرجن ایسا نہیں گزرا جس نے میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم نہ پائی ہو اور اطباء اور جراحوں کی صحبت میں بیٹھ کر اس فن کی عملی تربیت حاصل نہ کی ہو۔

پس اگر امراض جسمانی کے ازالے کے لیے کتابی علم کے علاوہ میڈیکل کالج میں پڑھنا اور سرجنوں کی نگرانی میں آپریشن کرنا مہارت وحذاقت کے لیے شرط اولین ہے تو امراض روحانی کے ازالے کیلئے روحانی کالج (خانقاہ) میں تربیت حاصل کرنا اور شیخ کامل کی نگرانی (نگاہ) میں رہ کر سلوک کی منزلیں طے کرنا (مہارت حاصل کرنا) کیوں لازمی نہ ہو۔

ہر شخص کا روزمرہ مشاہدہ ہے کہ دنیا کا کوئی فن (غواصی، جراحی، نجاری، طباخی، خیاطی، حملاجی، خطاطی) صاحب فن کی صحبت اٹھائے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔تزکیہ نفس بھی ایک فن ہے اور بہت مشکل فن ہے۔تو یہ فن کسی ماہر فن کی صحبت کے بغیر کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا ہے۔

جبھی تو علامہ اقبال مرحوم نے اس زمانے کے مغرب زدہ اور فلسفہ زدہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے:

کیمیا پیدا کُن از مشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

یعنی اے مسلمان! تو کیا ہے؟ ایک مشتِ گل ہی تو ہے۔اگر تو مٹی ہی رہا

تو ایک دن مٹی میں مل کر فنا ہو جائے گا، اس لیے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اس مشتِ گل (جسم یا شخصیت) کو کیمیا میں تبدیل کر لے اور اس کی وحدت صورت یہ ہے کہ کسی کامل کے آستان کو چوم یعنی کسی شیخ کامل کی صحبت اختیار کر۔

## خلوت یا ارتکاز

شیخ طریقت سالک کو کچھ عرصے کے لیے خلوت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور صوفیائے کرامؒ کے سوانح حیات کے مطالعے سے یہ ثابت ہے کہ ہر صوفی نے کچھ عرصے کے لیے خلوت اختیار کی ہے۔ اس کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ثبوت خود سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے مل سکتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قبل نبوت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سال تک غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی تھی۔

## اعتکاف یا گوشہ نشینی

شیخ طریقت بعض اوقات مرید کو اعتکاف کا حکم دیتا ہے اور یہ حکم بھی سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ ہر شخص جس نے سیرۃ النبی ﷺ کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے واقف ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ماہ رمضان کے آخری عشرے میں مسجد نبوی میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ رابطۂ قلبی پیدا کرنے کے لئے اعتکاف فی المسجد، اکسیر کا خاصہ رکھتا ہے۔ جسے شک ہو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ سلوک تو سراسر عملی پروگرام ہے۔

## مراقبہ و محاسبہ

شیخ طریقت مرید کو مراقبہ اور محاسبہ کا حکم دیتا ہے اور یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔

''وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ'' (۵۹:۱۸)

اور لازم ہے کہ ہر شخص یہ دیکھتا (غور کرتا) رہے کہ اس نے آئندہ کل قیامت کے لیے کیا توشہ آگے بھیجا ہے (یعنی کون کون سے اعمال صالحہ اس کے نامہ اعمال میں مندرج ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو محاسبہ کرنے کا حکم دیا اور ہر شخص جانتا ہے کہ محاسبہ مراقبے پر موقوف ہے مجاہدات جب تک مراقبہ نہ کیا جائے محاسبہ ناممکن ہے۔

تصوف میں مجاہدہ شرط لازمی ہے۔ کوئی سالک مجاہدے کے بغیر سلوک طے نہیں کرسکتا اور یہ شرط اس آیت سے ثابت ہے:

''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' (۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہم سے ملنے یا ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش (مجاہدہ) کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنی طرف آنے والی راہیں دکھا دیتے ہیں۔ سچ کہا ہے عارف شیرازیؒ نے۔

نـــاز پـــرورد تـــنـــعـــم نبـرد راہ بـدوســت
عـــاشـقـی شیـوئـہ رنـدان بـلا کـش بـاشـد

# ذکر و فکر

شیخ طریقت، مرید کو ذکر و فکر کا حکم دیتا ہے اور یہ تلقین ذکر و فکر، جس کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے، قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

''اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ. الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا''

(191,19.:3)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اوررات اور دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے (یہ وہ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور غور وفکر کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ کائنات بے فائدہ پیدا نہیں کی ہے۔

سالک کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ذکر کرتے رہو۔ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے۔

''وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (45:8)

اور یاد کرو اللہ کو بہت تا کہ تم فلاح پاؤ۔

مقصدِ حیات، فلاح دارین ہے اور حصول کی صورت ذکر کثیر ہے، اسی لیے صوفی ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے۔

ذکر کی اہمیت آئندہ واضح کی جائے گی، اس جگہ صرف اتنا بیان کرنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ:

''وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا'' (۱۸:۲۸)

اے رسول! مت کہا مانیے اس شخص کا جسے ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تو بوقت رخصت انھیں انہیں تاکید کی۔

''اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِىْ وَلَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ ۔'' (۲۰:۴۲) جا تُم اور تیرا بھائی (فرعون کے پاس) میری نشانیاں لے کر اور (دیکھنا) میری یاد میں سستی مت کرنا۔

## غیر مسلم اکابرین کے تاثرات:

اب ہم آپ کی خدمت میں چند مشہور و معروف چند غیر مسلم دانشوروں کے وہ بیانات قلمبند کر رہے ہیں جو کہ انہوں نے اسلامی تصوف کے بارے میں بعداز تحقیق جاری کیے۔

ڈاکٹر ڈونالڈسن اپنی کتاب ''مسلمانوں کا فلسفہء اخلاق'' میں صفحہ ۱۹۴ پر لکھتا ہے: ''بقول ابن خلدون، صوفیوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ آغاز اسلام سے مسلمانوں میں متداول تھا اور اکابر صحابہؓ اسے سچائی اور ہدایت کا طریقہ تسلیم کیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ عبادت اور تبتل پر مبنی تھا اور دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے دلوں میں دنیا کے محبت راہ پانے لگی تو جن لوگوں نے زہد و تقویٰ کو اپنا شعار بنایا وہ صوفیوں کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔''

پروفیسر گیوم اپنی کتاب ''اسلام'' میں صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴ پر لکھتا ہے: ''قرآنی تعلیمات میں دنیا سے بے تعلقی اور تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مسلمان صوفیوں نے ان دو آیتوں سے بہت تقویت حاصل کی ہے:

(الف) ''نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔'' (۵۰:۱۶)

ہم انسان سے، اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(ب) ''فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' (۲:۱۱۵)

پس تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں اللہ کا منہ ہے۔

یعنی تم جدھر دیکھو گے اللہ کو وہیں موجود پاؤ گے۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے بذات خود صوفیوں کی طرز حیات کے لیے سامان مہیا کیا ہے۔''

☆ پروفیسر رگب اپنی کتاب ''محمڈن ازم'' میں ص ۱۲۸ پر لکھتا ہے: ''پروفیسر میسی نیون نے اسلامی تصوف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں تصوف کی تحریک اُس زہد و اتقاء کا نتیجہ ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے اور پیغمبر اسلام کی سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔''

☆ ڈاکٹر تارا چند اپنی تصنیف ''ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر'' میں ص ۶۳ پر لکھتے ہیں: ''تصوف کا اصلی ماخذ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔''

☆ ڈاکٹر نکلسن نے اپنی تصنیف ''عربوں کی ادبی تاریخ ''ص ۲۲۹ پر ابن خلدون کی رائے سے اتفاق کیا ہے جسے ہم ڈونالڈسن کی شہادت کے سلسلے میں اوپر درج کر آئے ہیں۔

☆ پروفیسر ہٹی اپنی تالیف تاریخ اقوام عرب ص ۴۳۳ پر لکھتا ہے: ''تصوف کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے۔قرآن میں ایسے مضامین کی جو مثلاً ۴:۱۱۳ یا ۳۳: ۴۷ میں وارد ہیں کوئی کمی نہیں ہے۔علاوہ بریں خدا کے ساتھ خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذاتی تعلق میں صوفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی ہر جگہ شعور حاصل تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت یہ محسوس کرتے تھے کہ میں اللہ کی حضوری میں ہوں۔صوفیوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس روحانی تعلیم کے سچے ترجمان ہیں جو احادیث میں محفوظ ہے۔

☆ پروفیسر براؤن اپنی تالیف ''ایران کی ادبی تاریخ'' جلد اول میں ص ۴۱۸ پر لکھتا ہے: ''احادیث سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں چند آیات ایسی موجود ہیں جن کی تفسیر صوفیانہ انداز میں ممکن ہے۔ مثلاً:

''وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' (17:8)

اور اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (مٹھی بھر کنکریاں پھینکی تھیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔

بظاہر تو اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی ہمت بندھائی لیکن اس سے یہ مفہوم بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ دراصل ،اللہ ہی فاعل مطلق ہے اور انسان کی حالت ایسی ہے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم ہوتا ہے جس طرف چاہے موڑے۔''

☆ ڈاکٹر ہنٹ اپنی تالیف (Pantheism) مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۹۳ ص ۲۰۸ پر لکھتا ہے: ''پروفیسر پامرا نے لکھا ہے کہ تصوف دراصل اسلام کی باطنی تعلیم کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مبادی قرآن سے آخذ کیے جاسکتے ہیں لیکن قرآن عقیدہ حلول کی مطلق تائید نہیں کرتا۔''

☆ پروفیسر میکڈانلڈ اپنی تصنیف ''شئون اسلام'' میں ص ۱۸۴ پر لکھتا ہے :اسلام کی دوسری تعلیمات کی طرح تصوف کے مبادی بھی پیغمبر اسلام کے ذہن میں موجود تھے۔''

☆ پروفیسر آر بری اپنی تصنیف ''صوفزم'' (تصوف) میں ص ۱۲، ۱۳ پر لکھتے ہیں: '' قرآن مجید صوفیوں کے لیے وہ سند اعلیٰ ہے جس کی طرف وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔''

''ایک صوفی اتباع رسول پر مجبور ہے اس کے لیے حدیث کا مطالعہ لازمی ہے اس لیے حدیث قرآن کے بعد دوسرا استون ہے جس پر ایک صوفی کے دین و ایمان کا قصر تعمیر ہوا ہے۔''

# ہندئوں کا فلسفہ تصوف

## ہندی تصوف

اس بات پر دنیا کے تمام محققین کا اتفاق ہے کہ اپنشد، تصوف پر قدیم ترین تصانیف ہیں، جن میں تصوف کے تمام بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں ۔چنانچہ پروفیسر روائس (Royce) نے اپنی مشہور تصنیف ''کائنات اور فرد'' جلد اول باب چہار ص ۱۵۶ میں اعتراف کیا ہے کہ ''صوفیانہ عقائد کی پوری داستان ان کتابوں میں قلمبندی کر دی گئی ہے۔''

# زمانہ تصنیف

تمام محققین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اکثر و بیشتر اپنشدوں کا زمانہ تصنیف آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔تاہم اس میں شک نہیں کہ بعض اپنشد زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں اور ایک اپنشد جس کا نام ''اللہ اپنشد'' ہے، اکبر کے عہدِ حکومت میں تصنیف کیا گیا تھا۔

## اپنشدوں کی تعداد

اپنشدوں کی تعداد ایک سو آٹھ ہے چنانچہ مکتیک اپنشد میں ان سب کو نام بنام شمار کیا گیا ہے۔ (دیکھو ''ہندوستان کا ثقافتی ورثہ'' جلد اول، ص ۴۲)

ان میں سے شری شنکر اچاریہ کی رائے میں گیارہ اپنشد اہم ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سب کی شرح لکھی ہے اور ''برہم سوتر'' کی شرح میں چار مزید اپنشدوں کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے تین مزید اپنشد شامل کر کے کل اٹھارہ اپنشدوں کو اہم قرار دے کر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔

شہزاد محمد داراشکوہ قادری مرحوم (مرید حضرت مُلا شاہؒ خلیفہ حضرت میاں میرؒ) نے ۱۶۵۶ء میں باون اپنشدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس کا لاطینی ترجمہ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا۔ شیلنگ اور شوپن ہاور نے اسی ترجمے سے استفادہ کیا تھا۔ ۱۸۰۸ میں اس کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا۔ اسی فارسی ترجمے کا ہندی ترجمہ ۱۷۰۲ء میں شائع ہوا تھا اور ۱۸۶۱ء میں اسی کا اردو میں ترجمہ ہوا۔

## اپنشد کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

اپنشد کے لفظی معنی ہیں ''کسی کے پاس باادب بیٹھنا'' اور بقول شنکر اچاریہ اس کے اصطلاحی معنی ہیں ''برہمہ گیان'' حاصل کر کے جہالت کا ازالہ کرنا۔

## اپنشد کی تعلیمات کا مرکزی تصور

اپنشدوں کی تعلیمات کی روح ''عرفان حقیقت'' (برہمہ گیان) ہے۔ چنانچہ منڈک اپنشد میں یہ سوال کیا گیا ہے: ''وہ شے کیا ہے جس کا عرفان ہو جانے سے سارے جگت کا عرفان ہو سکتا ہے؟'' اور اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ

''وہ شے خدا ہے۔ اگر انسان کو اس کا عرفان حاصل ہو جائے تو ساری کائنات کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔

# اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ

برہمہ سوتر میں اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے چنانچہ شنکر اچاریہ نے اسکی شرح بھی لکھی ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انگریزی میں کیا ہے۔ انہوں نے ص ۲۵۱ پر لکھا ہے کہ برہمہ سوتر کے پہلے چار سوتروں میں تمام اپنشدوں کا خلاصہ بایں انداز درج کر دیا گیا ہے۔

☆ برہمہ گیان (خدا کا عرفان حقیقی) فلسفے اور مذہب دونوں میں آخری مسئلہ ہے۔

☆ اس کائنات میں برہمن (خدائے واجب الوجود) اعلیٰ حقیقت ہے اور وہ ایکم ادوِتیم (واحدہ، لاشریک لہ) ہے۔

☆ یہ عرفان بذریعہ وحی حاصل ہو سکتا ہے۔

☆ برہمہ گیان سے اطمینان قلب اور ابدی سرور حاصل ہو سکتا ہے۔

اب ہم اپنشدوں کی اہم تعلیمات ذیل میں درج کرتے ہیں:

☆ حقیقت، الواحد ہے اور یہ کائنات اُس ذات یکتا و یگانہ کا مظہر ہے۔ اس کے سوا کوئی شے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

☆ وہ حقیقتہ مطلقہ، ستیم (حق) جنانم (مدرک بالذات) اور انتم (لامتناہی) ہے۔

☆ یہ کائنات جیسی نظر آتی ہے، ایسی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی۔ وہ مختار مطلق ہے، کوئی شخص اُس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

☆ یہ کائنات سراسر غیر حقیقی (دھوکا) نہیں ہے بلکہ حقیقی بھی ہے اور غیر حقیقی بھی ہے۔ یہ کائنات اس اعتبار سے حقیقی (خارج میں موجود) ہے کہ مظہر ذات حق ہے۔ اور اس اعتبار سے غیر حقیقی ہے کہ بذات خود، موجود نہیں ہے۔ یعنی اس کی حقیقت، وجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ جب کہ حق تعالی (برہمہ) کی حقیقت، وجود ہے۔ وہ بالذات موجود ہے یعنی واجب الوجود ہے۔

☆ یہ ذات واجب، یہ حقیقتہ کبری قرم (مطلق) ہے، ستہ ستیم (حقیقتہ الحقائق) ہے۔ جیوتشم جیوتش (نور الانوار) ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے متھ کلپنا (موجود فی مرتبتہ الوہم) ہے۔ وہ مخفی بھی ہے آشکار بھی ہے۔ باطن بھی ہے ظاہر بھی ہے۔ وہ ذات پاک زمان و مکان و سلسلہ علتہ و معلول سے بالاتر ہے۔ وہ اوے یکت (نہاں) بھی ہے اور وے یکت (عیاں) بھی ہے۔ وہ سرو و یاپی (حیط کل) ہے ہے اور کائنات کے پو ذرے میں انتریامی (جاری و ساری) بھی ہے۔ کوئی انسان اس کی کنہ یا حقیقت کو نہیں پا سکتا چنانچہ "کین اپنشد" میں مذکور ہے کہ "نہ اسے آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں نہ لفظوں کے ذریعے سے بیان کر سکتے ہیں نہ اس کی ذات کا تصور یا تعقل کر سکتے ہیں۔"

☆ یہ کائنات سراپا متھ (نمود) ہے بلکہ نمود بے بود ہے اور حق تعالی سراسر ستہ (وجود) ہے۔

☆ عرفان ذات حق، اس کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

☆ دنیا میں رہو مگر اس سے دل مت لگاؤ۔ ویراگ (تبتل یا انقطاع عن

ماسوی اللہ ) بہترین طرز حیات ہے۔

☆ دنیا کی نعمتوں سے تمتع جائز ہے مگر انھیں مقصود حیات بنانا ناجائز ہے کیونکہ جو شخص فانی چیزوں سے دل لگاتا ہے وہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔

☆ انسان کے حقیقی دشمن باہر نہیں ہیں بلکہ اندر ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں (۱) کام (شہوۃ)۔(۲) کرودھ (غضب)۔(۳) موہ (حرص۔)(۴) لوبھ (۵) اہنکار (عُجب)۔

☆ جب تک ان دشمنوں (اور نفس امارہ انھی کے مجموعے کا نام ہے) کو مغلوب نہیں کرو گے، عرفان (برہم گیان) حاصل نہیں ہو سکتا (نفس امارہ انہی پانچوں دشمنوں کے مجموعے کا نام ہے)۔

☆ جسے برہم گیان حاصل ہو جاتا ہے وہ خود برہمن ہو جاتا ہے یعنی اس میں برہمن کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

☆ جب انسان عارف ہو جاتا ہے تو اس میں یہ چار صفات پیدا ہو جاتی ہیں : (۱) اطمینان۔(۲) ہمت۔(۳) طاعتہ۔(۴) خدمت خلق ۔پھر وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جیتا ہے۔

☆ عارف وہ ہے جو ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھتا ہے۔توحید حقیقی یہی ہے کہ دوسرے کا خیال دل سے نکل جائے۔

☆ ایشور (خدا) صرف انہی کو درشن دیتا ہے جو اس کے دیدار کے لیے بیتاب ہیں، اور اسے حاصل کرنے کے لیے سراپا جستجو ہیں۔

☆ اسے پانے کی شرائط حسب ذیل ہیں : (۱) دم (ضبط نفس)۔(ب) دان (ایثار)۔(ج) دیا (شفقت)۔(د) جپ (ذکر)۔(ہ) تپ (مجاہدہ)

(و) دھیان (مراقبہ)۔

☆ ایشور، انسان کے ہردے (قلب) میں وشرام (استراحت) کرتا ہے۔وہ اپنے عاشقوں کے دل میں سکونت پذیر ہے۔

☆ جو خدا کے سوا غیر سے دل لگاتا ہے وہ ابدی محرومی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔انسان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ وہ سنسار (دنیا) سے دل لگائے۔

☆ مبارک وہ ہے جو جیتے جی عرفان حاصل کر لے، جو ایسا نہ کر سکے اُس سے بڑا بد بخت کوئی نہیں۔

☆ یادرکھو! خدا کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود کائنات ایک نمود بے بود ہے۔

☆ وہ صرف ایک ہے، اکیلا ہے، یکتا ہے، یگانہ ہے، ایکم ستہ دویتو ناستی اللہ ایک ہے، دوسرا موجود نہیں ہے (لا الہ الا اللہ)

☆ دوئی ساری خرابیوں، غلط فہمیوں، جہالت اور نادانی کی جڑ ہے۔

☆ برہمن ہی ساری کائنات کی اصل بنیاد ہے۔

☆ معرفت باری صرف انو بھو (مشاہدے) سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ برہم جگیاس (معرفتِ باری تعالی)، دھرم جگیاس (علم شریعت) سے بالاتر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو عالم شریعت ہے وہ عارف بھی ہو۔علم کتابوں سے حاصل ہوتا ہے، معرفت عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ عرفان حق، نہ کتابوں سے حاصل ہوسکتا ہے نہ عقل سے نہ استدلال سے نہ گفتگو سے نہ مناظرے سے۔یہ نعمت تو صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ خدا، اپنے آپ کو صرف اپنے عاشقوں پر ظاہر کرتا ہے۔

☆ اطمینان قلب صرف اسے حاصل ہوسکتا ہے جو ایشور کا جلوہ اپنے اندر دیکھ لے۔

☆ عرفان ذات سے انسان غیر فانی ہو جاتا ہے۔

☆ عرفان ، نہ پستکوں سے حاصل ہوتا ہے نہ حواس خمسہ سے یہ نعمت تو گرو (مرشد) کے چرنوں میں بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ آزادی چاہتے ہو؟ عرفانِ الٰہی حاصل کرلو۔

☆ ابدی اور حقیقی مسرت صرف غیر محدود سے ہم آغوش ہو کر حاصل ہو سکتی ہے ۔کوئی محدود (فانی) چیز آتما (روح) کو شانتی (اطمینان) عطا نہیں کر سکتی۔

☆ فانی سے دل لگانا سب سے بڑی نادانی ہے۔

☆ حقیقی علم وہ ہے جس کے ذریعے سے خدا کو پا سکو۔

☆ گیان اور دھیان کا مقصد یہ ہے کہ خدا سے وصل نصیب ہو جائے ۔یعنی اس کا قرب حاصل ہو جائے ۔خدا چونکہ ستیہ (حق)، چتیہ (ادرک) اور انند (خیر مطلق) ہے ۔اس لیے قدرتی بات ہے کہ جو اُس سے واصل ہو جائے اس میں بھی یہی صفات پیدا ہو جائیں۔

☆ جس طرح آگ سے چنگاریاں نکلتی ہیں اسی طرح ایشور سے ارواح کا صدور ہوتا ہے اور انجام کار یہ ارواح اُسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔
(منڈک اپنشد ۲۔۱۔۱)

☆ خدا سے ملنے کے آرزو مند ہو؟ خدا کے عاشقوں کی صحبت اختیار کرو۔اُس سے ملنے کا دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

☆ خدا کا گیان صرف وجدان سے حاصل ہو سکتا ہے ۔حواس اور عقل دونوں حقیقت رسی سے قاصر ہیں۔

☆ مقصدِ حیات ،دیدار ہے ۔جسے دیدار حاصل نہ ہو سکا اس کا جیون اکارت

گیا۔

☆ الحق یا المطلق کو صرف اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ بھی نہیں ہے، یہ بھی نہیں ہے (نا ایتی نا ایتی)۔ پھر وہ کیا ہے؟ اس کا بیان لفظوں کے ذریعے سے ناممکن ہے۔ جس طرح گنے کی مٹھاس کی ماہیت اور کیفیت کو لفظوں سے نہیں سمجھا سکتے اسے کھا کر دیکھ لو۔ اسی طرح خدا کی ماہیت اور کیفیت کو لفظوں سے واضح نہیں کر سکتے۔ خدا سے مل کر دیکھ لو۔ عرفانِ ذات، قیل و قال سے بالاتر ہے۔

☆ برہمن (الحق اور المطلق) ایک زندہ حقیقت ہے۔ وہ اپنی شان اطلاق میں نرگن (خالی از صفات) ہے مگر جب وہ مرتبہ خالق میں نزول کرتا ہے تو سوگن (صاحب صفات) کہلاتا ہے۔ برہمن (واجب الوجود) اور ایشور (خالق) یہ ایک یہ ذاتِ حق کی دو مختلف شانیں ہیں۔ یعنی جب مطلق اپنی فعلیت کا اظہار کرتا ہے تو اسے ایشور کہتے ہیں۔

☆ برہمن تو واجب الوجود ہے۔ یہ سنسار ممکن الوجود ہے۔ ممکن کیا ہے؟ وہ ہستی جس میں برہمن کے تصورات بالفعل ظاہر ہوں۔

☆ کائنات کو مستقل بالذات یا حقیقی سمجھنا ہی سب سے بڑی نادانی اور سب سے بڑا دھوکا ہے۔ یہ کائنات خدا سے اسی طرح صادر ہوئی ہے جس طرح شعاعیں آفتاب سے صادر ہوتی ہیں۔

☆ خدا ہر شے میں پوشیدہ ہے اور ہر شے میں جلوہ گر ہے اور ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

☆ اطمینان قلب تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اعمال حسنہ عشق اور

مراقبہ۔

☆ دھرم (مذہب) کی روح کیا ہے؟ اس بات کا انکشاف کہ ایشور میرے اندر جلوہ گر ہے۔

☆ مقصدِ حیات، برہمن کو پانا ہے یعنی اُس سے ذاتی اتصال پیدا کرنا۔ اس کیفیتِ اتصال کو بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ واصل ہو کر دیکھ لو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

☆ ذاتِ مطلق (برہمن) نے جب تخلیق کا ارادہ کیا تو مرتبہ (۱) بطون (اوے یکت) میں نزول کیا۔ اس کے بعد (۲) مہاں آتما (روح) میں، اس کے بعد (۳) بدھی (عقل) میں، اس کے بعد (۴) من (دماغ) اس کے بعد (۵) ارتھ (معلوم حواس) میں، اس کے بعد (۶) اندریوں (حواس) میں۔

☆ مرتبہ تنزیہہ میں ذاتِ باری، ناقابلِ فہم و افہام ہے۔ ہاں مرتبہ تشبیہ اسماء و صفات کو اُس سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ذاتِ حق، جامع تشبیہ و تنزیہہ ہے۔

☆ علم کی دو قسمیں ہیں: (الف) علمِ استدلال جو دنیاوی معاملات میں کار آمد ہے۔ یہ علم بقول شیخ ہجویریؒ اور امام غزالیؒ کتابوں اور منطقی قضایا سے حاصل ہوتا ہے لیکن اس سے روح کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ (ب) علم روحانی یا علم الٰہی جس کی بدولت حق واضح ہو سکتا ہے۔ یہی حقیقی علم ہے اور یہ علم فضل رب پر موقوف ہے۔ یہ فیضان الٰہی ہے جو عاشقوں کو حاصل ہوتا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ تزکیہ نفس ہے۔ اس کے بعد مراقبہ کیا جاتا ہے۔ انجام کار مکاشفہ نصیب ہو جاتا ہے۔

☆ اپنشدوں میں بنیادی طور پر عقیدہ توحید (وحدۃ الوجود) کی تشریح کی گئی ہے، یعنی لا موجود الا اللہ جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنیٰ میں اللہ (ایشور) کے سوا کوئی شے موجود نہیں ہے۔ یہ کائنات اس کا خیال ہے اور اس قادر مطلق خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے خیال کو خارج میں متشکل کر دیا ہے یعنی یہ کائنات اس کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

☆ کائنات کا وجود نہ تو خدا کے وجود کی طرح حقیقی ہے اور نہ عنقا یا پریوں کے وجود کی طرح غیر حقیقی بلکہ اسے وجود حسی حاصل ہو گیا ہے کہ دیکھو تو موجود ہے، غور کرو تو اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جس طرح شعلہ جوالہ کی گردش سے جو دائرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود محسوس و مشہود تو ہے مگر دراصل اس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے۔

☆ ''حق تعالیٰ متحرک بھی ہے غیر متحرک بھی ہے۔ وہ چلتا بھی ہے ساکن بھی ہے، دور بھی ہے قریب بھی ہے۔ وہ اندر بھی ہے باہر بھی ہے'' (ایشن اپنشد منتر نمبر ۵)

☆ ''یہ ساری کائنات برہمن ہی سے صادر (ظاہر) ہوئی ہے۔ جو اشیاء مشہود ہیں وہ بھی۔ برھمن سے معمور ہیں اور جو غیر مشہود ہیں وہ بھی مگر وہ اپنی ذات کے اعتبار سے جیسا تھا ویسا ہی ہے۔'' (سوتیاس وتر اپنشد ۴۔۲ تا ۴)

نوٹ: اس سے ثابت ہوا کہ اپنشدوں میں حلول (Pantheism) کی تعلیم ہرگز نہیں دی گئی ہے۔ جیسا کہ اکثر مغربی حکماء یا مستشرقین اور اُن کے شاگردوں کو اس بات میں شدید غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے۔

☆ اس تمام ظہور و صدور اور کثرت مظاہر کے باوجود، برہمن (حق سبحانہ) اپنی ذات میں بجنسہٖ قائم ہے یعنی حق اور خلق میں عینیت مطلقہ ثابت نہیں ہے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے بلکہ غیریت بھی متحقق ہے۔ کوئی ویدانی، حلول (Pantheism) کا قائل نہیں ہے۔اسی طرح شیخ اکبرؒ اور اُن کے متبعین بھی حلول کے قائل نہیں ہیں۔

اپنشدوں کی تعلیمات کا جو خلاصہ ہم نے بیان کیا ہے، اس کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص اس نتیجے پر پہنچے گا کہ:

☆ پہلی صدی عیسوی سے لے کر آج تک تمام صوفیاء کے بنیادی تصورات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

☆ اپنشدوں کی روح، وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہے اور مختلف زمانوں میں دنیا کے مختلف صوفیہ، حکماء اور شعراء اس کے قائل رہے ہیں۔

لیکن اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ اُس مماثلت سے جو مختلف اقوام اور مختلف زمانوں کے صوفیوں میں پائی جاتی ہے، یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، بلکہ خلاف واقعہ ہے، کہ ازمنہ مابعد کے صوفیہ کے اپنشدوں کی تقلید کی ہے۔ کیونکہ افلوطین نے اپنشدوں کا کبھی مطالعہ نہیں کیا اور شنکر اچاریہ نے افلوطین کی تصانیف نہیں پڑھیں۔ اور شیخ اکبرؒ نے شنکر اچاریہ کی شروح سے کوئی واقفیت حاصل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حکماء آزادنہ تفکر اور تدبر سے ایک ہی نتیجے پر پہنچے کہ لاموجود الا اللہ۔ اسی لیے افلوطین، شنکر اچاریہ اور شیخ اکبرؒ کی تعبیرات میں فرق نظر آتا ہے۔ نتیجہ یکساں ہے مگر منہاج فکر (Approach) جداگانہ ہے۔

# جہالت کے خاتمے کے طریقے:

شری شنکر نے جہالت کے ازالے کیلیے مکمل دستور العمل پیش کیا ہے۔ اسکے مطالعے سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ انہیں عقلیت کے ساتھ ساتھ روحانیت میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔

پہلی شرط: ویراگ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ان امور سے قطع نظر کرنا جو دل کو خدا سے غافل کردیں۔(اسے عربی میں تبتّل کہتے ہیں)ویراگ کا حصول چار باتوں پر موقوف ہے:

(الف) فانی اور باقی میں امتیاز کرنا اور فانی اشیاء سے قطع نظر کرنا۔

(ب) لذات دنیوی سے کنارہ کشی۔

(ج) اپنے اندر چھ صفات پیدا کرنا:سکون قلب، پرہیز گاری،ترک امور لایعنی، ہمت مردانہ، یکسوئی اور ذوق یقین۔

(د) حصول حریت کاملہ کا جذبہ پیدا کرنا۔

دوسری شرط: تزکیہ نفس ہیاوراس کے تین مراحل ہیں:

مرحلہ اول: مرشد کامل کی صحبت اختیار کرنا۔

مرحلہ دوم: ذکروفکر۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے اس صداقت کا علم حاصل کرو کہ ''لا موجود الا اللہ''یعنی برہمن نہیں ہے۔اس کے بعد اس قال کو اپنا حال بناؤ۔

مرحلہ سوم: دھیان (مراقبہ)یعنی اب دل کی آنکھ سے اس کے درشن کرو کیونکہ مقصود حیات محض علم خدا نہیں ہے، بلکہ دیدار خدا ہے۔یعنی سالک کو انُوبھُو (براہ راست مشاہدہ) ہو جائے کہ کائنات میں اس کے سوا

کوئی موجود نہیں ہے۔

جب سالک ذات حق کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو جیون مکت ہو جاتا ہے۔ اسے حقیقی حریت حاصل ہو جاتیہے یعنی تمام بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔نہ اسے کسی سے خوف باقی رہتا ہے اور نہ کسی سے کوئی توقع رکھتا ہے۔جب کسی میں کوئی قدرت یا طاقت ہی نہیں تو کسی سے خوف کیوں ہو؟اور جب کوئی کچھ دے ہی نہیں سکتا تو کسی سے طمع بھی کیوں ہو؟ یہ وہ حالت ہے جسے شنکر اچاریہ نے حریت نفس سے تعبیر کیا ہے۔جب انسان جیون مکت ہو جاتا ہے تو وہ اپنی زندگی مخلوقات کو نفع پہنچانے اور ان کی سیوا کرنے کے لیے وقف کر دیتا ہے کیونکہ اسے حق الیقین حاصل ہو چکاہ کہ ہر شے مظہر ذات ہے۔اسے ہر شے میں اپنا محبوب جلوہ گر نظر آتا ہے۔وہ سب سے محبت کرتا ہے۔کیونکہ اس کی نگاہ میں سب اپنے ہیں، غیر کوئی نہیں۔

ویدانت (وحدۃ الوجود) کا عقیدہ انسان کے اندر بنی آدم کی خدمت اور ان پر شفقت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ حقیقی توحید تمام خود ساختہ امتیازات کو مٹا دیتی ہے۔عارف کی نگاہ میں ہر شے مظہر ذات ہے،اس لیے وہ کسی سے نفرت نہیں کر سکتا،کسی کا برا نہیں چاہ سکتا۔اس کی نگاہ میں ہندو اور مسلمان،کالا اور گورا،مغربی اور مشرقی،مندر اور مسجد،عورت اور مرد،دولتمند اور مفلس،عالم اور جاہل،نکوکار اور بدکار،شریف اور رذیل،شہری اور دیہاتی سب انسان یکساں ہو جاتے ہیں کیونکہ سب میں اسی کا جلوہ ہے۔

ا۔ خدا کا عرفان اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو صاحب عقل ہو،ذہن و فطین ہو اور حصول عرفان کا شوق رکھتا ہو۔

۲۔ حصول عرفان کے لیے یکسوئی اور توجہ اشد ضروری ہے۔

۳۔ جو شخص اطمینان قلب سے محروم، دنیا میں گرفتار ہو، جس نے اپنے نفس کا تزکیہ نہ کیا ہو، جسے اپنے حواس پر قابو نہ ہو جو مراقبہ اور مجاہدہ نہ کر سکے وہ عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔

۴۔ اگر برہمن کو مقصود بنا لو، اگر اس سے محبت کر سکو اور اس کی یاد سے لذت حاصل کر سکو تو حواس پر قابو پا سکتے ہو۔ اور اگر یہ نعمت حاصل ہو جائے تو "من" (نفس امارہ) پر قابو پا سکتے ہو۔ اگر من پر قابو حاصل ہو جائے تو خود بینی اور تکبر سے رہائی پا سکتے ہو۔ اگر خود بینی سے باز آ سکو تو خدا بیں بن جاؤ گے۔

۵۔ خدا خود تمہارے اندر موجود ہے، تم اس کا دھیان کرو۔ وہ یقیناً تمہیں مل جائے گا۔ یعنی تم خود برہمن بن جاؤ گے۔

۶۔ اندر اور باہر ہر جگہ برہمن کے درشن ہوں۔ یہی تصوف کا ثمرہ ہے۔

۷۔ مرشد رہنمائی کر سکتا ہے مگر اَودِیا کے سمندر سے نکلنے کے لیے تمہیں خود مجاہدہ کرنا پڑے گا اور جب تم مجاہدہ کرو گے تو خدا کا فضل تم پر نازل ہو گا۔

۸۔ خدا ہی ہر طرف جلوہ گر ہے مگر ہم جہالت کی وجہ سے اس کے دیدار سے محروم ہیں۔ اگر دل کی آنکھوں سے دیکھیں تو وہ ہر شے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

گذشتہ اوراق میں دیئے گئے مضامین سے قارئین کرام کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ تصوف کسی ایک معاشرہ یا کسی ایک مذہب کا خاصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان صوفیائے کرام کے پاس ہر مذہب و ملت کے لوگ آزادانہ آتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔

جناب چراغ قادری صاحب نے آپ کے مرشد حضرت سید اسر مست کا قرب حاصل کرنے کے حوالہ سے یوں تحریر کیا ہے کہ:

شیخ دولہؒ کے شاہ سیداؒ کے حضور میں آنے سے بہت پہلے منگو نام ایک خادم آپ کے پاس رہتا تھا جسے آپ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔شیخ پا گئے کہ اس کی رضا کے بغیر یہاں قدم ٹکانا ممکن نہیں ہوگا۔چنانچہ اس کے ساتھ بھی سلسلہ مدارات قائم کیا اور دل و جان سے شاہ کی بندگی میں لگ گئے۔ہمیشہ سیالکوٹ جا کر کسب گدائی کرتے اور کاسہ میں روٹیوں کے ٹکڑے سجائے شاہ سیداؒ کے حضور پیش کر دیتے۔شاہ صاحب ان میں سے بقدر حاجت کھاتے اور کاسہ واپس کر دیتے جسے شیخ اب منگو کی طرف بڑھا دیتے جو اپنا حصہ لے کر ان کا حصہ ان کے لیے چھوڑ دیتا تھا خواہ اس سے پیٹ بھرا جاتا خواہ نہ بھرا جاتا۔آٹھ پہر روزانہ اسی خوراک پر شاہ کی خدمت میں آپ کمر بستہ رہتے۔ شیخ کہتے ہیں کہ ایک دن شاہ سیدؒ غضب میں آ کر مجھے کہا کہ یہ مانگے کے ٹکڑے اور لوگوں کے چبائے ہوئے نوالے کب تک مجھے لا کر دیتا رہے گا کہ طبیعت ان کو کھانے سے کراہت کرتی ہے ۔کتنا اچھا ہو کہ دس ناخنوں کی محنت سے کھائی ہوئی طیب چیز لا کر دیا کرے جسے ہم کھایا کریں چنانچہ میں تعمیل ارشاد میں سیالکوٹ کو چل دیا جہاں ان دنوں پرانے زمانے کی عمارت زمین میں سے برآمد ہوئی تھی اور بادشاہ کے حکم کے مطابق وہاں سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر نئے قلعہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔میں نے اس کام کی اجازت لی اور کھدائی کرنے لگ گیا۔

مزدوری کا دستور یہ تھا کہ ایک ذرعہ زمین طولاً عرضاً کھودنے کا ایک تنکہ ملتا تھا اور وہ عمارت چونے اور گچ سے یوں مضبوط بنائی ہوئی تھی کہ بہت ہمت والا

مزدور بھی دن بھر میں دو تین ذرعہ سے زیادہ نہیں کھود سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے میں نے ستر ذرعہ کھدائی کی جسے دیکھ کر کار پرداز حیران ہو گئے اور آپ میں کہنے لگے کہ یہ کسی آدم زاد کا کام نہیں ہو سکتا اور جب انہوں نے مجھے ستر تنکے دیئے تو میں نے چار تنکے لے لیے کہ اتنوں کی ضرورت تھی اور باقی لوٹا دیئے۔

بازار میں گیا دو تنکے کی کھچڑی اور تین بہلولی کا گھی اور ایک بہلولی کا ایندھن خریدا اور کھچڑی میں گھی ڈال کر شاہ سیدؒ کے حضور پیش کر دی۔ آپ نے محبت بھری گالی دے کر کہا کہ تو نے خیال کیا ہو گا کہ آج اس قدر مشقت کی ہے اور تجھے پتہ نہیں کہ دن بھر کی محنت میں سیدا بھی برابر شریک رہا ہے۔ ادھر آ اور میرے ہاتھوں کو دیکھ کہ ان پر کتنے چھالے پڑے ہوئے ہیں بہر حال کھچڑی کھا کر آپ نے فرمایا کہ آج کھانے کا مزا آیا۔ ہاتھ کی کمائی کی اپنی ہی لذت ہوتی ہے۔

اس میں سے تھوڑا سا تبرک مجھے بھی دیا۔ جسے کھاتے ہی میری دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں درد اُٹھ کھڑا ہوا۔ آٹھ پہر ہائے وائے کرتے کٹ گئے تو منگو نے میرے واویلے سے متاثر ہو کر شاہ صاحب کے آگے سفارش کی کہ بڑا خدمتی آدمی ہے توجہ کیجئے کہ اسے درد سے نجات مل جائے آپ نے فرمایا کہ منگو تو نہیں جانتا کہ یہ میرا ذرمتاع غلام ہے اور تو دیکھے گا کہ آج کل میں ہی میری ساری دولت غارت کر دے گا۔ ایسے کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تا کہ پتہ چل جائے کہ اپنے قاعدہ پر قائم رہتا ہے کہ نہیں پھر روئے مبارک میری جانب کر کے فرمایا کہ تمہارے درد کا علاج محلہ قصاباں میں ہے۔ وہاں جا کر ذبح کی گئی گائے کی رودہ میں سے انہوں نے جو تازہ گوبر نکالا ہو گا اس میں اپنا ہاتھ ڈال دے۔ میں نے ایسا کیا ہی تھا کہ درد کافور ہو گیا اور پھر نیند ایسی آئی کہ ایک دن رات وہیں

سو یار ہا۔ جب بیدار ہوا اور ہاتھ اس گوبر سے نکالا تو درد کا نشان تک نہ تھا۔ لیکن درمیان کی بڑی انگلی غائب تھی۔ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو توجہ کر کے فرمانے لگے کہ اے بندے تیرے، وجود میں خودی تھی جواب مٹ گئی۔ اب تیرے اندر سے غیر والی کدورت نکل گئی ہے اور مادۂ عبودیت باقی رہ گیا ہے۔ خاطر جمع رکھ کہ ہماری عنایات کے تو قابل ہو گیا ہے۔ میں کورنشات بجا لایا چنانچہ ہر روز میرے حال پر مہربانی فرمانے لگے۔''

یوں بارہ برس آپ نے ان کی خدمت کی سعادت حاصل کی اور پھر شاہ سیدؒ اکو اطلاق واسہال کا وہ مرض لاحق ہو گیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے۔ منگو جموں سے واپس آیا تو حالات کو بدلا ہوا پایا۔ رگ حسد اس میں پھڑک اُٹھی اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر اس نے شیخ دولہؒ کو خوب پیٹا اور گلیم چھین کر گھر کو چلتا ہوا آپ جب ضربوں سے کچھ بحال ہوئے تو سہکوتی پر و چھوڑ کر سیالکوٹ چلے گئے جہاں لوگ آپ کے پاس ہجوم در ہجوم آنے لگے۔ یہاں آکر آپ نے ایک بڑا تالاب اور ایک باغ مرمت کروائے جن کو قادری کے کہنے کے مطابق بعد میں مولوی عبداللہ نے ویران کر کے اپنا محلّہ آباد کر لیا۔ امام علی الحق کے مقبرہ مقدسہ کا گنبد بھی بنوایا۔ ایک نالے پر بڑا پل بنوایا شاہ سیدؒا اور پیر سبزؒ کے روضہ مبارک بنوائے۔ عید گاہ شہر کے مغرب کی جانب بنوائی ،کنویں، خانقاہیں اور تکیے درویشوں کے لیے بنوائے کہ جن کا شمار ممکن نہیں ہے ادھر جب منگو نے حسد کو بے نتیجہ پایا تو گلیم واپس لا کر آپ کو دے دی۔ اور خود بھی آپ کی خدمت میں رہنے لگا۔

جناب پروفیسر شریف کنجاھی صاحب اپنی کتاب کے صفحہ 34 پر اس

سلسلہ میں کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

چراغ قادری کے برعکس خزینتہ الاصفیاء کا مصنف غلام سرور لاہور رقم طراز ہے کہ حضرت سرمست کا ایک اور مرید بھی تھا جس کا نام دولہ تھا (منگو نہیں تھا )اور حضرت کا خیال یہی تھا کہ باطنی دولت اسی کو ارزانی کی جائے گی چنانچہ وقت موعودہ آیا (اور اس انداز میں نہیں جس کو قادری نے بیان کیا ہے ) تو حجرہ میں سے آواز دی کہ اے دولے ادھر آ۔ اتفاق سے وہ دولہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا شاہ دولہؒ موجود تھا اور وہ حاضر ہو گیا۔ آپ نے کہا کہ تجھے نہیں بلایا دولےؒ کو بلایا ہے۔ شاہ دولہؒ لوٹ آئے اور حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے اور پھر جس قادری نے لکھا ہے مجبوراً باطنی دولت شاہ دولہؒ کو ارزانی کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر کر امولا دہد شاہ دولہ گرود''

ایلیٹ نے لکھا ہے کہ جب وقت اخیر آ پہنچا تو منگو مرید خاص کو بلایا لیکن اس نے رات گئے آنے سے انکار کر دیا تین بار ایسا ہی ہوا تو پیر کچھ دیر خاموش رہے صبح کو ہوش میں آئے تو کہا کہ خدا جسے چاہتا ہے نوازتا ہے۔ پس انہوں نے دلق درویشی شاہ دولہؒ کو دے دی۔ قادری کی روایت سے مختلف ایلیٹ لکھتا ہے کہ جب شاہ دولہؒ نے خدشہ ظاہر کیا کہ منگو اس سے وہ دلق لے لے گا تو آپ نے فرمایا کہ جو اس کو اٹھا لے گا یہ اسی کی ہو گی اور چونکہ وہ منگو سے اٹھائی نہ جا سکی اس لیے شاہ دولہؒ صاحب نے اسے جھاڑ جھٹک کر زیب بدن کر لیا۔ ایلیٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ باری باری اور چیلوں نے بھی اس گلیم کو اٹھانا چاہا اور پھر منگو کے ساتھ مل کر بھی جسے موکھو بھی لکھا گیا ہے سب نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ شاہ دولہؒ کے سوا کسی سے اٹھائی نہ گئی۔ ایلیٹ یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس واضح کامیابی کے

باوجود جو شاہ دولہ کو حاصل ہوئی اور گلیم زیب تن کر لینے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاسد پیر بھائیوں نے شاہ دولہؒ صاحب کا وہاں رہنا دشوار کر دیا اور آپ سیالکوٹ سے نکل کر دس سال تک اسی نواح میں رہنے کے بعد گجرات میں اقامت گزیں ہو گئے۔ لیکن سلیم التواریخ کے مصنف کے مطابق شاہ دولہؒ صاحب اپنے مرشد کی اجازت سے اور ان سے اشارہ پا کر ہی گجرات رہنے لگے تھے جہاں سے گاہے گاہے سیالکوٹ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔

اب اگر اسے درست مان لیا جائے تو قادری اور ایلیٹ کی بیان کردہ گلیم درویشی والی باتیں ایک اختراع ہو کر رہ جاتی ہیں اور ''شاہ دولہ'' ''گرود'' والی روایتیں بھی بدقسمتی سے سلیم التواریخ میں سے وہ حوالہ نہیں مل سکا جس کی بنا پر اس بات کا وزن کیا جا سکے کہ کیا واقعی شاہ دولہؒ صاحب اشارہ مرشد پا کر گجرات چلے گئے تھے۔ چراغ قادری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ امام علی الحق نے ایک بار خواب میں آپ کو اشارہ کیا تھا کہ لوگ تمہارے پاس ہر وقت یوں بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کو میرے پاس یعنی میرے روضہ پر آنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس لیے تم گجرات چلے جاؤ اور وہ تعمیل ارشاد میں گجرات چلے گئے۔

ان ہم آہنگ نہ ہوتی ہوئی روایتوں میں سے ہمارے پاس احتیاط کی راہ یہی رہ جاتی ہے کہ ہم شاہؒ صاحب کو شاہ سیدؒا کا مرید تسلیم کریں اور گلیم اٹھانے والی بات کو علامتی انداز بیان سمجھیں جس کے مافیہ کی تصدیق وقت نے کر دی کہ مرشدی گلیم جسے سزاوار تھی اسے ہی ملی اور ناسزاوار دعویداروں کو وقت نے گمنامی کے گڑھے میں پھینک دیا۔ مرشد کے حکم سے یا امام علی الحق کے اشارے سے سیالکوٹ چھوڑنے کی بات میں اہل ارادت کی سعادت قلبی کو دخل ہو سکتا ہے کہ

انہوں نے خلافت اور جانشینی کے جھگڑے کا جو اکثر ایسے موقعوں پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے ایک اچھا سا حل نکالنے کی سعی کی اور لکھ دیا کہ آپ مرشد کے کہنے پر سیالکوٹ چھوڑ آئے تھے اور کسی باہمی رقابت کی بنا پر نہیں ہوسکتا ہے اس بات کے لیے مشتاق رام کے کرامت نامہ درج ایک کرامت سے ذہن اس طرف چلا گیا ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ دولہؒ صاحب نے کنارہ دریا پر تکیہ مرتب کرنے کی اجازت چاہی تھی تا کہ وہاں یادِ خدا کی جائے۔

لیکن تاریخی تذکروں کی بساکھیوں سے ان بے نیاز لوگوں کے بارے میں کنج کاوی کی وادی کا سفر اختیار کرنے والے اخلاف کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی ہیں اور شیرازے کا ایک تار سمیٹنے لگتے ہیں تو دوسرا بکھرنے لگتا ہے۔اس کا احساس مجھے ریاض مفتی صاحب کے شاہ دولہ دریائیؒ پر زمیندار ڈگری کالج کے مجلہ شاہین میں درج مضمون کی یہ عبارت پڑھ کر ہوا کہ شاہ سیدا سرمستؒ کا مزار سیالکوٹ میں ہے اور مشن ہائی سکول کے ہوسٹل کے مغرب میں اگر ایسا ہی ہے تو چراغ قادری کی اس بات کو اس سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے کہ شاہ سیداؒ نے سہکوتی پرہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے اور اگر مفتی صاحب کی تحقیق ہی درست ہوتو پھر یا تو دونوں کو الگ الگ شخصیتیں ماننا پڑتا ہے یا پھر چراغ قادری کو ایک ضعیف راوی۔خاص طور پر جب سلیم التواریخ میں بھی مندرج ہو کہ شاہ سرمستؒ کا مزار سیالکوٹ میں شا دولہؒ صاحب نے بنوایا تھا۔لیکن اسے ماننے میں تردد اس لیے ہوتا ہے کہ ایلیٹ اور قادری کے بیان کے مطابق شاہ دولہؒ صاحب مرشد کے کفن دفن سے فارغ ہو کر خلافت کے معاملہ میں حاسدوں سے تنگ آ کر مرشد کا گاؤں چھوڑ گئے اور سیالکوٹ چلے گئے جہاں وہ دس سال رہے۔دوسری

روایت کے مطابق آپ مرشد کی مرضی سے اور ان کی زندگی ہی میں گجرات چلے گئے۔گاہے گاہے مہینہ مہینہ دو دو مہینہ کے لیے وہاں جا رہتے پھر خدمت شریف میں حاضر ہو جاتے (سلیم التواریخ ۴۰۰)ان میں سے گجرات مرشد کی مرضی سے جانیوالی روایت کو درست مانیں تو ان ایام میں گجرات سے سیالکوٹ جا کر مقبرہ بنوانا بلکہ وہ تمام عمارتیں بھی جن کو ان سے منسوب کیا جاتا ہے ناممکن تھا۔دوسری روایت کو درست ماننا کہ پیر بھائیوں کے رویے سے تنگ آ کر آپ نقل مکانی کر گئے لیکن سال ہا سال سیالکوٹ میں رہے تو اس صورت میں بظاہر سیالکوٹ میں مقبرہ کی تعمیر دشوار کام نہیں تھا لیکن پہلے تو پتہ چلنا چاہیے تھا کہ جسے سہکوتی پرہ میں دفن کیا گیا تھا اسے بعد میں سیالکوٹ کب لایا گیا۔عارفوں کے بارے میں ایسا کئی بار ہوا لیکن اس سلسلہ میں تاریخ اور تذکرے کے تقاضے تو پورے ہونے چاہیں ۔ممکن ہے جس طرح پیر سبز کا ایک مزار سیالکوٹ میں ہے اور ایک کنجاہ میں اسی طرح شاہ سیدؒ کا بھی ایک علامتی مقبرہ سیالکوٹ میں بنالیا گیا ہوں اور سہکوتی پرہ پختہ نہ ہونے کے باعث لقمۂ خاک ہو گیا ہو۔

خزینتہ الاصفیاء جلد دوم میں صفحہ نمبر 102 تا 104 پر درج ہے کہ

آپ اعاظم اولیائے کمال اور کبرائی مشائخ باحال وقال میں سے ہیں۔ جامع فتوحات ظاہری و باطنی وکمالات صوری ومعنی ہیں۔آپکے آبائے کرام کا شجرہ بادشاہ بہلول لودھی سے جاملتا ہے اور پیران عظام کا سلسلہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے۔اس طرح کہ حضرت شاہ دولہؒ مرید اور خلیفہ تھے۔سیدنا سرمستؒ کے۔وہ مرید تھے حضرت شاہ موز گا کے، وہ مرید شاہ کبیرؒ کے اور وہ مرید شیخ شہر اللہؒ کے اور وہ مرید شیخ یوسفؒ کے اور وہ مرید پیر برہانؒ کے اور وہ مرید شیخ صدر الدینؒ کے اور

وہ مرید شیخ بدر الدینؒ کے، وہ مرید شیخ اسماعیل قریشیؒ کے اور وہ مرید حضرت شاہ صدر الدین راجن قتالؒ کے اور وہ مرید شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانیؒ کے اور وہ مرید شیخ صدر الدین عارفؒ کے اور وہ مرید غوث بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے قدس سرہم العزیز۔ اور اہل بہشت پیرانِ چشت سے فیض کامل آپ تک پہنچا اور اپنے وقت کے کاملوں میں سے ہوئے۔ طفولیت کے زمانہ میں ہی ماں باپ اللہ کو پیارے ہوئے اور وہ بے پدر مادر یتیم رہ گئے۔ بعض حق ناشناس لوگوں کے ہاتھ لگ گئے جنہوں نے آپ کو ہندوؤں کے آگے فروخت کر دیا۔

غلامی کے اس دور کی خلعت کے بعد آپ سیدنا سرمست سیالکوٹی کے حضور جا پہنچے جو اپنے وقت کے قطب تھے اور ان کے مرید ہو گئے اور چند سال ان کی خدمت میں بسر کئے۔ شیخ کا ایک اور مرید بھی تھا جس کا نام دولا تھا اور آپ اپنی باطنی نعمت اسی کو ارزانی کرنا چاہتے تھے۔ جب شیخ کا آخری وقت آن پہنچا اندرون حجرہ سے آپ نے آواز دی کہ اے دولہؒ آجا۔ وہ دولا اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ شاہ دولاؒ حاضر ہو گئے۔ آپ نے کہا کہ میں نے تجھے نہیں بلایا دولےؒ کو بلایا ہے۔ شاہ دولہؒ واپس جا کر دروازے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر شیخ نے دولاؒ کو آوار دی۔ چونکہ وہ اب بھی موجود نہیں تھے اس لئے شاہ دولہؒ حاضر ہو گئے۔ شیخ نے نعمت باطن ان کو ہی دے دی اور کہا کہ جسے مولا دیتا ہے وہ شاہ دولہؒ ہو جاتا ہے یہ کہا اور رحمت حق سے پیوست ہو گئے۔

بعد زاں شاہ دولاؒ پر کچھ عرصہ سکر و جذب و مستی کی حالت طاری رہی۔ یہاں تک کہ فرض اور سنتیں بھی ترک ہو جاتی رہیں۔ ویرانے میں پلنگوں اور شیروں سے انس ہونے لگا۔ جب اس کیفیت سے واپس آئے تو فتوحات ظاہری و

باطنی کے دروازے آپ پر کھل گئے۔ بے حساب خوارق و کرامات کا ظہور ہونے لگا۔ دنیا و عقبیٰ کے بے شمار حاجت مند لوگ حاضر ہو کر مرادیں پانے لگے۔ شاہین، باز اور پلنگ ایسے بہت سے درندے اور پرندے آپ کی سرکار میں رہتے تھے۔ خزانہ غیب تک آپ کی رسائی تھی بے شمار زر نقد تھا اور بے حساب ہی خرچ کرتے تھے۔ مسکینوں کو دیتے اور بہت بڑا لنگر لگا رہتا۔

بڑی بڑی عمارتیں مثلاً کنوئیں، سرائیں، پُل اور مساجد تعمیر کرتے رہتے۔ چنانچہ آپ کی عمارتیں گجرات اور سیالکوٹ میں ابھی تک یادگار ہیں۔ آپ کی سرکار امراء وملوک کی سرکاروں ایسی تھی۔ استغراق اور دم شہود حقانی رکھتے تھے۔ اکثر اوقات ماسوا اللہ سے بے خبر رہتے تھے اور مراقبہ میں سر ڈالے بیٹھے رہتے تھے۔ اور یوں تعلق بسیار کے باوجود مجرد سے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ مشائخ متاخرین میں سے عالم ظاہر و باطن جس فتوح سے آپ کو نوازا گیا مشائخ کرام میں سے کسی اور کو ارزاں نہ ہوا۔ خیر وشر میں سے جو کچھ آپ کی زبان سے نکل جاتا ہو کر رہتا۔ آپ کی دعا کا تیر کبھی خطا نہ جاتا۔ سماع و وجد میں کاملِ تواجد علوی رکھتے تھے، آپ کی مجلس کبھی سماع سے خالی نہ ہوتی۔

ایک بار حاسدوں، عناد رکھنے والوں اور تنگ نظروں نے آپ کے خلاف شکایت لکھ دی اور آپ کو تنگ کرنے کے درپے ہو گئے۔ لیکن شاہ جہاں بادشاہ بے تعصب حاکم تھا وہ ایذا رسانی پر آمادہ نہ ہوا۔ اگر کوئی بے اولاد حصول اولاد کی خاطر آپ کی خدمت میں آکر طالب دعا بحضور کبریا ہوتا تو آپ فرماتے کہ اگر اپنا بڑا بیٹا ہماری نذر کرے گا تو خالق حقیقی کی درگاہ سے اولاد پائے گا۔ سائل قبول کرتا اور پہلا بیٹا جو اس کے گھر میں ہوتا اس کی بعض مخصوص علامات ہوتیں۔ اوّل یہ کہ سر

چھوٹا ہوتا۔ دوسرے وہ گونگا ہوتا اور بے زبان۔ تیسرے مجذوب اور مسلوب الحواس۔

جب اس کا بیٹا پیدا ہوتا ماں باپ اس کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے آتے۔ آپ اسے قبول کر کے اپنے پاس رکھ لیتے۔ اس طرح کے سینکڑوں بچے جن کو شاہ دولا کے چوہے کہا جاتا۔ آپ کے ہاں موجود رہتے۔ ان کو کھانا لنگر سے ملتا تھا۔ یہ کرامت ابھی تک آپ کے مزار سے جاری ہے اور ہر سال دور دراز کے ملکوں سے ایسے بچے جن کو شاہ دولہؒ کے چوہے کہا جاتا ہے مزار گوہر بار پر آتے رہتے ہیں۔ اور اولاد کے خواہش مند دور دور کے شہروں سے مزار گوہر بار پر آکر اپنے ایک بچی بچے کی نذر مان کر چلے جاتے ہیں۔ اور جب ان کے ہاں اسی شکل وصورت کا بچہ پیدا ہو جاتا ہے اسے مزار پر چڑھا جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سال کہ تالیف کتاب کا سال ہے چار نر اور مدہ بچے اسی شکل وشباہت کے مزار پر موجود تھے۔

صاحب معارج الولایت کا کہنا ہے کہ میں سفر حسن ابدال کے وقت شاہ دولہؒ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ مراقبہ میں تھے اور قوال خواجگان چشت کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ جب آپ نے مراقبہ سے سر اٹھایا تو میری طرف توجہ فرماتے ہوئے مجھے مٹھائی عطا فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ بندہ کو عطائے ظاہری کی طلب نہیں ہے نعمت باطنی سے حصہ چاہتا ہوں۔ متبسم ہوئے اور کہا کہ اسے بھی لے لو اور وہ بھی دے دوں گا۔ چنانچہ بندہ کے حال پر بے شمار عنایات باطنی وظاہری ارزانی فرمائیں۔

اس جامع الکمالات کی وفات صاحب فجر الواصلین کے مطابق ۱۰۸۵ھ میں ہوئی اور صاحب شجرہ چشتیہ کے مطابق ۱۰۷۵ھ میں اور دوسری بات زیادہ

ٹھیک ہے۔صاحب شجرہ چشتیہ نے بزرگان سہروری کے حالات میں آپ کی تاریخ وفات اس مصرع سے اخذ کی ہے۔"بجنت ۱۰۷۵ ارسید شہ دولا"۔ اور" خدا ۱۰۷۵ ادوست" سے بھی آپ کا مزار گوہر بار شہر گجرات پنجاب میں زیارت گاہ خلق ہے۔آپ کی اولاد میں سے پیر بہاون شاہ نے تعمیر مزار کی ذمہ داری نباہی اور آج کل وہی امام اور سجادہ نشین مزار ہے۔قطعہ تاریخ وفات از مؤلف۔

چو شہ دولا ولی باعزت و جاہ     زدینا رفت در فردوس شاداں

بسرور شدندا تاریخ سالش     کہ شاھنشاہ دولا قطب دوراں

معروف تحقیق اور تاریخ دان اے ۔سی ۔ایلیٹ نے "کرانیکل آف گجرات" میں حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کے بارے میں یوں درج کیا ہے کہ:

یتیم اور بے سہارا رہ جانے پر شاہ دولہؒ نے دریوزہ گری کا ارادہ کرلیا۔ اسی پالبغری میں وہ سخی سیالکوٹ پہنچ گیا۔ جہاں اس کی ملاقات مہتہ کیما سے ہوگئی جو وہاں کے قانون گوؤں کا مالک تھا اور متمول وخدا ترس لیکن بے اولاد۔اس نے ترس کھا کر جس کو اچھی شکل وصورت نے مستزاد کر دیا مہتہ کیما نے اسے اپنا لیا اور نازو نعمت سے پرورش کرنے لگا۔شاہ دولہؒ کی ذہانت نے قانون گوؤں کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے توشہ خانہ کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔لیکن وہ اس قدر کشادہ دست تھا کہ مزاجاً کسی سائل کو نہ نہیں سکتا تھا۔نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف اس کا اپنا اندوختہ ختم ہو گیا بلک توشہ خانہ کا سارا سامان ،نقود اور قیمتی اشیاء بھی غائب ہوگئیں۔

قانون گوؤں نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ تمام چیزیں محتاجوں کو دی گئی ہیں اور اسے ماخود کروا کر عقوبت کا نشانہ بنایا۔جس کی شدت سے مجبور ہوکر شاہ دولہؒ نے کہہ دیا کہ اس نے دولت کہیں دفن کی ہوئی ہے اور

اگر اسے رہا کیا جائے تو اسے کھود نکالے گا۔ چنانچہ اسے توشہ خانہ میں لے گئے جہاں اس نے لخت ایک خنجر دیوار خانہ میں سے لے کر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ قانون گوؤں پر اس اقدام سے ارباب اختیار کا خوف طاری ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے کسی ماہر طبیب کو بلایا جس نے زخم کو باندھ دیا۔ تین ماہ میں کہیں جا کر یہ زخم مندمل ہوا۔

اب قانون گوؤں نے اسے آزاد کر دیا اور وہ سنگھوٹی چلا گیا جو سیالکوٹ کے قریب ہی ایک گاؤں تھا۔ وہاں جا کر وہ ایک مردِ خدا شاہ سیدن سرمست ؒ کا چیلا ہو گیا۔ یہاں شاہ دولہ ؒ نے سرمست کے ایک اور چیلے منگو یا موکھو کا تقرب حاصل کر لیا جو اس مرد خدا کا منظور نظر تھا۔ اور دویوزہ گری اختیار کر لی یوں جو ٹکڑے اسے حاصل ہوتے ولی کے آگے لا کر رکھ دیئے جاتے۔ ان میں سے اشتہا کے مطابق کھانے کے بعد باقی ماندہ منگو کی طرف سرکا دیا جاتا اور منگو شکم آسودہ کرنے کے بعد جو تھوڑا بہت بچ رہتا شاہ دولہ ؒ کو دے دیتا جسے پیٹ بھر کر کھانا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ لیکن ان ناقص حاصل کردہ خیرات سے ولی کو تسلی نہ ہوتی چنانچہ اس نے شاہ دولہ ؒ کو مزدوری کرنے اور نقد اجرت حاصل کرنے پر لگا دیا جس سے پکا پکایا کھانا خرید جا سکتا تھا جو خیرات سے حاصل ہونے والے باسی ٹکڑوں کا نعم البدل تھا۔

ان دنوں سیالکوٹ میں ایک نیا قلعہ تعمیر ہو رہا تھا اور ان اینٹوں سے جو بعض پرانی عمارات کی بنیادوں میں سے حاصل ہوتی تھیں۔ شاہ دولہ ؒ کو ایک عام مزدور کی طرح ایک ٹکہ یعنی دو پیسے فی مربع گز کھدائی کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ مسالہ اس قدر سخت تھا کہ بڑے بڑے طاقتور بھی دن بھر میں دو تین گز سے زیادہ کھدائی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن شاہ دولہ ؒ نے اس حیرت انگیز قوت کے ساتھ کام کیا

کہ پہلے دن ہی ستر مربع گز کھدائی کر ڈالی اور اینٹوں کو الگ کر دیا۔ افسران نے اسے فوق البشری امداد سمجھتے ہوئے ستر ٹکے یعنی اس کے کام کی پوری مزدوری دی اور بغیر کسی لیت ولعل کے۔ لیکن شاہ دولہؒ نے صرف چار ٹکے قبول کیے۔

اس طرح چار ٹکے حاصل کر کے اس نے مزے دار کھچڑی کی ایک رکابی خریدی اور مرشد کے حضور پیش کر دی۔ جہاں اس کی اپنی قوت کار کا بھی مخریہ اظہار ہو گیا۔ لیکن مرشد نے اسے اپنے ہاتھ دکھائے جو اس غیر مردی معاونت کے باعث جو شاہ دولہؒ کی اس نے کی تھی چھالے چھالے ہو گئے تھے۔ از راہ عنایت مرشد نے اسے بھی تھوڑی سی کھچڑی دی جس سے شاہ دولہؒ کی دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں کھانا آغاز کرتے ہی اس قدر شدید درد اٹھا کہ دنوں تک وہ نہ سو سکا نہ آرام کر سکا۔ اور آخر اس نے مرشد سے التجا کی کہ اس کا دکھ دور کیا جائے۔ منگو نے بھی سفارش کی اور مرشد نے بالآخر شاہ دولہؒ کو قصابوں کی گلی میں جا کر کسی تازہ ذبح کی گئی گائے کی انتڑیوں میں ہاتھ ڈال دینے کی ہدایت کی۔ ایسا کرتے ہی اس کا دکھ مسافر ہو گیا اور وہ چوبیس گھنٹے تک گہری نیند سویا رہا۔ لیکن جاگا تو دیکھا کہ وہ انگلی کٹ کر گر چکی ہے۔ بہر حال وہ مرشد کے پاس آیا اور اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا جس پر اسے بتایا گیا کہ ''اے بندے تجھ میں اس قدر خود غرضی بھری ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ تجھ سے نکل چکی ہے اور اس کی جگہ اب دوسروں کی محبت ہی تجھ میں رہ گئی ہے۔ تم نے اپنے آپ کو میرا منظور نظر اور معرفت الٰہی کا اہل ثابت کر دیا ہے۔''

بارہ سال تک شاہ دولہؒ نے مرشد کی خدمت میں کاٹے جو سہروردی سلسلہ کا فقیر تھا۔ بارہویں سال کے آخر میں سرمستؒ نے محسوس کیا کہ اس کا وقت قریب آ گیا ہے تو اس نے پوچھا کہ کون موجود ہے۔ جواب ملا کہ ''دولہ'' سر

مستؒ نے دولے کو کہا کہ جا کر موکھو کو لے آؤ یعنی منظور نظر منگو کو چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے منگو نے آنے سے انکار کر دیا۔ دولہ تین بار گیا اور تینوں بار منگو نے انکار کیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد گورو صبح کے قریب اٹھا اور کہا۔ ''خدا جسے چاہتا ہ دیتا ہے'' چنانچہ اس نے اپنی دلق دولے کو دے دی اور جب دولہؒ نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ منگو اسے یہ دلق اپنے پاس نہیں رکھنے دے گا تو گورو نے کہا کہ جو اسے اٹھا لے گا یہ اسی کا مالا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے دلق شاہ دولہؒ کے حوالے کر دی اور اسے دعا دیتے ہوئے چل بسا۔

دن چڑھا تو خبر پھیل گئی کہ سرمستؒ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ موکھو اور دوسرے چیلوں نے کفن دفن میں مل کر حصہ لیا اور پھر دلق قبضہ میں کرنا چاہی جو زمین پر گر پڑی۔ باری باری سب نے کوشش کی بعد میں مل کر بھی اٹھانا چاہی لیکن بے سود دولہؒ نے اسے ایک ہاتھ سے پکڑا چھٹکا دیا اور پہن لی۔ یوں اس نے ثابت کر دیا کہ نام اور اعزاز کا وہی مستحق ہے اور اسی نام یعنی شاہ دولہؒ سے وہ ازاں بعد یاد کیا جاتا رہا ہے۔ سیالکوٹ کو خیر باد کہتے ہوئے اور اپنے حاسد ہم مرشدوں کو چھوڑتے ہوئے شاہ دولہؒ کچھ عرصہ قصبے سے باہر روپوش رہے شاہ سیدن کی وفات کے دس سال بعد تک وہ اسی نواح میں رہے ان کی شہرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور با اثر بھی۔ آپ نے بہت سی عمارتیں بنائیں۔ مساجد ،تالاب، پل اور کنویں بنوائے جن میں سے زیادہ قابل ذکر ایک نالے کا پل ہے اس کے بعد شاہ دولہؒ نے گجرات میں جا ڈیرا لگایا اور غالباً اشارہ غیبی کی تکمیل میں وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

فقراء کا خیال ہے کہ ہر شہر کا ایک نگران ولی ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ دولہؒ کو

گجرات کا نگران سمجھا جاتا ہے۔دوران حیات انہوں نے اپنے آپ کو رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے اور دینی عمارات کے لیے وقف کر رکھا۔ان کے بڑے بڑے کارناموں میں سے ایک وہ پل ہے جو گجرات شہر کے شرقی دروازے کی جانب نالہ شاہ دولہؒ پر بنا ہوا ہے اور دوسرا وہ جو ڈیک پر گوجرانوالہ ضلع میں ہے۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی سے روپیہ پیسہ نہیں مانگا تھا۔لیکن کام کرنے والوں کو محنتانہ فی الفور کر دیا جاتا تھا۔قدیم کھنڈروں کا سراغ لگانے کا بھی ان کو خوب ادراک تھا ۔یوں وہ اپنی تعمیرات کے لیے ضروری مسالہ کھود نکالا کرتے تھے۔غریبوں کے ساتھ ان کا رویہ فراخ دلانہ تھا اور بلا لحاظ قوم و مذہب۔

جنگلی جانوروں کے لیے ان میں ایک خاص کشش تھی چنانچہ ہر قسم کے درندے اور پرندے انہوں نے رکھے ہوتے تھے۔ان کی رواداری نے ان کو ہر طبقہ میں مقبول بنایا ہوا تھا۔یہی وجہ تھی کہ ان کے عقیدت مندوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔اپنی کرامتوں کی بدولت ان کا شہرہ بہت تھا اور لوگ بہت نذرانے لے کر آتے۔وحشی جانوروں کے اندر ان کے لیے انس ان کے بارے میں خوش عقیدگی کا بڑا سبب تھا۔

اکبر بادشاہ کی وفات کے وقت شاہ دولہؒ بھی سیالکوٹ میں تھے۔اور جہانگیر کے ساتویں سال جلوس میں وہ گجرات چلے گئے۔یعنی ۱۰۲۲ھ بمطابق ۱۶۱۲ء اکبر اور شاہ دولہؒ کی ملاقات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔البتہ جہانگیر کے ساتھ ان کی ملاقات کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے کہ ''شاہ دولہؒ صاحب اپنے من چاہے جانوروں کے سروں پر ٹوپیاں پہنائے رکھتے تھے جن پر کوڑیاں ملی ہوتی تھیں ۔ایک دن اس انداز سے آراستہ ان کا ایک ہرن چلتا چلتا ادھر جا نکلا جہاں شاہدرہ

لاہور کے قریب شاہ جہانگیر شکار کھیل رہا تھا۔

شاہ نے کلاہ پوش ہرن دیکھا تو ہم رکابوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا جس کے جواب میں اسے شاہ دولہ اور ان کی کرامات کے بارے میں بتایا گیا۔

اس ہرن کو تو پکڑ لیا گیا اور دو آدمی شاہ دولہؒ کو لانے کے لیے ارسال کیے گئے جو اس وقت اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔اسی دن شاہ دولہؒ صاحب نے اپنے چیلوں کو کہا تھا۔''ہمارے ہرن دربختے نے کیا عجیب حرکت کی ہے۔وہ شہنشاہ کے پاس جا پہنچا ہے اور شاہ کو مجھے بلانے کے لیے دو آدمی بھیجنے کی زحمت دے دی ہے آج وہ آجائیں گے ان کے لیے مزے دار پلاؤ اور ہر قسم کی خوردنی چیزیں تیار کرو۔''حیرت زدہ ملازمین نے کھانا تیار کر دیا اور شام کے قریب شہنشاہ کا پیغام لیئے ہوئے قاصد آن پہنچے۔

حکم شاہ کو سر پر رکھتے ہوئے شاہ دولہؒ صاحب اسی وقت چل پڑنا چاہتے تھے۔لیکن بھوکے قاصدوں نے کھانے کی باس پالی تھی اسی لیے وہ رات خانقاہ ہی میں رہ پڑے اور دوسرے دن شاہ صاحب کو ساتھ لے کر شاہدرہ پہنچے۔وہاں جاتے ہی شاہ صاحب نے کچھ چیزیں منگوانے کے لیے کہا اور ان سے ایک ''من'' تیار کیا جسے رومات میں لپیٹ کر بادشاہ کے حضور جب بلایا گیا تو پیش کیا گیا۔بادشاہ اس وقت نور جہاں کے ساتھ تخت پر بیٹھ ہوا تھا۔دونوں ہی شاہ صاحب کی مقدس صورت سے بہت متاثر ہوئے۔بادشاہ نے شاہ دولہؒ صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے سنگ پارس کہاں سے حاصل کیا ہے۔لیکن شاہ صاحب نے ایسے کسی پتھر کے پاس ہونے سے انکار کیا اور کہا کہ وہ خیرات پر گزراہ کرتا ہے۔

لیکن شاہ کو آپ میں ایک متمول اور با اثر شخصیت کو جھلک ملی ۔جس سے بغاوت برپا کرنے کا امکان ہو سکتا تھا۔اور نور جہاں نے مشورہ یہی دیا کہ ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے ۔بادشاہ کے حکم پر شاہی خانسا ماں نے ایک زہریلا سبز پیراہن تیار کیا جسے شاہ دولہؒ صاحب کو پہنایا گیا لیکن آپ کو کوئی گزند نہ پہنچی ۔اب پہلے سے بھی زیادہ زہر آلودہ پیراہن پہنوایا گیا لیکن وہ بھی بے اثر رہا۔

آخر شاہ نے زہر بھرا شربت کا ایک جام تیار کرنے کو کہا لیکن اس کا تخت کانپنے لگا۔محل بُری طرح ہلنے لگا اور ہر طرف فقراء کے چہرے نظر آنے لگے ۔ڈر کر بادشاہ نے آپ کی ولایت کو تسلیم کر لیا اور عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا بلکہ دو تھیلیاں اشرفیوں کی بھی نذر کیں ۔جنہیں وہیں ملازمان شاہی میں تقسیم کر دینے کے بعد شاہ کو دعائیں دیتے ہوئے شاہ دولہؒ صاحب وہاں سے چل پڑے۔یہ سن کر بادشاہ نے ان کو پھر بلا بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ خانقاہ کے لیے پانچ ہزار بیگہ زمین قبول کر لی جائے۔

شاہ صاحب نے کہا کہ انہیں ارضی کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ضرورت پڑی تو پھر اس شاہی پیش کش کو قبول کر لیا جائے گا۔اس پر شاہ نے اظہار احترام کرتے ہوئے آپ کو جانے کی اجازت دے دی۔

ڈیک پر پل باندھنے کی داستان کچھ اس طرح ہے ۔کشمیر کی جانب شاہ جہاں کی آمدرفت کے دوران ایک بار داراشکوہ اور حوری بیگم کا ذاتی سامان اور کچھ مال اسباب سے لدے ہوئے جانور ڈیک کا لقمہ ہو گئے جس میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ضلع کے فوجدار مرزا بدیع عثمان کو چنانچہ حکم دیا گیا کہ ہم رکبان شاہی کے لوٹنے تک ایک مستقل اور پختہ پل تیار کر دیا جائے ۔فوجدار نے کام آغاز کر دیا لیکن کچی اینٹوں کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہ لگا۔چنانچہ اس نے خشت سازوں کو پکڑ

کر مقید کر دیا۔ یوں بادشاہ کی مراجعت تک اس پل کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ جب سختی کے ساتھ اس سے جواب طلبی کی گئی تو فوجدار نے بتایا کہ صرف شاہ دولہؒ صاحب ہی اس پل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

شاہ نے اسی وقت اسے حکم دیا کہ شاہ دولہؒ کو جا کر لایا جائے۔ بڑے حیلے سے آپ کو ایک پالکی میں بٹھایا گیا اور پھر لے کر چل دیئے۔ آپ نے کہا۔ ''شاہ کے احکام کی تعمیل پر مجھے مجبور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کو جانتا ہوں اور ان کو بجا لاؤں گا۔''

ڈیک پر پہنچ کر شاہ دولہؒ صاحب نے پہلے تو خشت سازوں کو رہا کروایا اور پھر پل کی تعمیر میں لگ گئے۔ ایک بدفطرت گورو جو اسی نواح میں رہتا تھا اس کام کو اسی عجلت سے برباد کر دیتا جس سے اسے کیا جاتا۔ لیکن آخر ایک مناظرہ کے بعد اسے شکست ہوئی اور اسے شاہ دولہؒ صاحب نے چونے کی حوض میں گرا کر گردن تک چونے اور گارے میں دھنسا دیا۔

آپ کو وہاں اور بھی دشواریاں پیش آئیں۔ جن میں سے ایک بوٹا نامی ایک نواحی زمیندار کی کھڑی کی گئی تھیں جو اس گھاٹ سے گزرنے والوں سے پیسے (ٹیکس) وصول کیا کرتا تھا۔ بوٹے نے وہ بند جس کی اوٹ میں درویش ڈیرہ ڈالے ہوتے تھے کاٹ ڈالا تا کہ وہ سب غرق ہو جائیں۔ لیکن شاہ دولہؒ صاحب نے نیچے کی جانب ایک اور بند بنا کر اس کی اس سازش کو ناکام بنا دیا اور ایک درویش شاہ جہاں کے پاس شکایات کرنے کے لیے لاہور روانہ کر دیا گیا جس نے حکم صادر کیا کہ بوٹے کو ہاتھ پاؤں باندھ کر دربار میں حاضر کیا جائے تا کہ اس کا

سر قلم کر کے نیم کے پیڑ پر لٹکا دیا جائے۔ لیکن شاہ دولہؒ صاحب نے بیچ بچاؤ کر کے اس کی جان بخشی اور رہائی کروا دی۔ اسکے بعد بوٹے نے اس سلسلہ میں ہر ممکن امداد دی۔ پل مناسب طریقہ سے تعمیر پایا اور پھر شاہ دولہؒ صاحب واپس گجرات کو لوٹے۔

جناب محترم پروفیسر شریف کنجاہی صاحب نالہ ڈیک کے بارے میں بعد از تحقیق رقمطراز ہیں کہ اس نالہ کا ذکر شاہ جہان نامہ جلد اوّل میں پہلی بار جہانگیر کے بیٹے شہر یار کی بغاوت کے ضمن میں صفحہ 174 پر یوں آیا ہے کہ " افواج منصوره را که از همه جهت بده هزار تن نمی کشید توزك شایان وترتیب نمایاں داده روز شنبه یازدهم ربیع الاوّل سنه هزار وسی و هفت هجری مطابق بیست و هشتم آبان ماه درسه کروهی لاهور نزدیك (پل شاہ دولہ کو لاہور سے شمال کی جانب بارہ کوس کے فاصلہ پرولیم اروِن نے بنایا ہے۔) پل دیك راوی در برابر مخالفاں بایں دستور صف حصاف و یساق قتال آراست." فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ "دیك اسم دیپر آب راوی است. ملاحظہ کیند بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری صفحہ 608 جلد دوم طبع ببلیو تھیکا اندیکا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے وضاحت کی ہے کہ یہ نالہ علاقہ جموں سے نکلتا ہے جہاں اس کا نام دیو کا ندی ہے۔ پھر علاقہ سیالکوٹ میں آ کر ڈیک کہلاتا ہے۔ تحصیل ظفر وال و پسرور کے علاقے سے گذر کر تحصیل رعیہ میں۔ وہاں سے شر قپور سے گزر کر جنوبی

موضع جھانبرہ علاقہ سید والا کے قریب راوی میں جا گرتا ہے۔لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان اس ندی پر ایک پُل پُل شاہ دولہ کے نام سے موجود ہے۔''ڈاکٹر صاحب نے اپنا مآخذ خلاصۃ التواریخ کو اور مفتی غلام سرور کو بتایا ہے۔

دوسری بار اس نالہ کا نام شاہ جہاں کے دور میں مراجعت کشمیر کے ذکر میں آیا لیکن جیسا کہ باب ہشتم میں بتایا گیا ہے بادشاہ نے ہاتھی پر بیٹھ کر اسے عبور کیا اور یوں اس پر پُل کے نہ ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ پُل ہونے کی صورت میں ''بسواری فیل گذشتہ'' لکھنے کی ضرورت نہیں تھی اور اگر مان لیا جائے کہ پل کے باوجود سیلاب کی شدت کے باعث فیل (ہاتھی) سواری کو مناسب جانا گیا تو بھی کسی وقائع نگار نے یہ نہیں لکھا کہ دیک پر وہ پل شاہ دولہؒ صاحب نے بنوایا تھا۔ہوسکتا ہے راوی کے پل کو پل دیک راوی لکھے جانے سے بعد کے ارباب نگارش نے راوی کا لفظ چھوڑ دیا ہو اور اسے آب راوی''کے دوسرے نام کے باعث دیک کے نام سے بہنے والا نالہ مراد لے لیا ہو کیونکہ بندر بھاگا کی طرح راوی کو دیک بھی کہتے تھے۔

یوں جسے خلاصۃ التواریخ کے مصنف سبحان رائے نے پل شاہ دولہؒ کہا ہے اور دیک پر بتایا ہے وہ اصل میں وہی پل دیک رہا ہوگا۔خان ولی اللہ صاحب نے جن کا محکمہ آثار قدیمہ سے تعلق ہے ۹ جنوری ۱۹۶۶ء کے پاکستان ٹائمز میں لکھا تھا کہ دیک والا پل اپنی شکستہ حالی کے باوجود زبان حال سے یہی کہتا نظر آتا ہے کہ اسے سرکاری سرپرستی میں بنایا گیا تھا۔لیکن شاہ جہاں نامہ جلد اول میں اسے

پل دیک راوی کہنا اور پل شاہ دولہؒ نہ کہنا بھی غور طلب ہے اور اس کی دلیل کہ دارا شکوہ اور حوری بیگم کے سامان کی غرقابی اس کی تعمیر کا سبب نہیں تھی اور نہ چراغ قادری والی مذکورہ بات۔

اسی طرح یہ بھی قابل توجہ ہے کہ دہلی سے کشمیر جانے کے متعدد راستے تھے۔ایک راستہ (لاہور سے جموں کشمیر کو جانے والی بڑی راہ ظفر وال کے پاس سے گزرتی ہے۔) کی طرف اشارہ یونیورسٹی اورنیٹل کالج لاہور کے مجلّہ تحقیق جلد ۳ شمارہ ۴ میں دلشاد پسروری کے بارے میں ڈاکٹر سید سلطان محمد حسین صاحب کے مضمون سے بھی ملتا ہے جس میں لکھا کہ ''شاہ جہاں ایک دفعہ دہلی سے کشمیر جارہا تھا۔فتح الدین (دلشاد کے اسلاف میں سے) بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا۔

راستہ میں موضع بانگے (نزد علی پور سیداں) میں پڑاؤ ہوا_ ''اور ممکن ہے کہ اس راہ میں دیک پر کوئی پل (جو پاٹ کے مطابق بہت بڑا نہیں ہوگا) شاہ دولہؒ صاحب کی توجہ سے بن پایا ہو کہ اسی علاقہ میں پانی کا زور (سیلاب کے دنوں میں بالخصوص) اسے ناقابل عبور کر دیتا ہے اور سال کا بیشتر حصہ اس میں پانی بھی اِدھر ہی رہتا ہے۔پھر ادھر سے ہی سیالکوٹ کے لوگوں کا گجرات سے قریبی رابطہ بھی ہے جیسا کہ خود چراغ قادری نے شاہ دولہؒ صاحب کے آخری ایام کے ضمن میں بتایا ہے کہ وہ میانی ملاحاں سے دریا پار کر کے گجرات چلے گئے۔

سیالکوٹ گزیٹیر میں دیک کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نالہ جسر وتہ کے شمال میں دو ندیوں کے ملاپ سے وجود آشنا ہوتا ہے۔تحصیل ظفر وال کے شمال مشرقی گوشہ میں گہری گاؤں کے پاس۔پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو

سارے ظفر وال میں سے ہوتی ہوئی پسرور کے قریب مل جاتی ہیں۔لیکن دو میل کے فاصلہ پر پھر دو ہو جاتی ہیں۔ایک جنوب کو بہتی ہوئی رعیہ Raya تحصیل میں پھر اصل سے واصل ہو جاتی ہے۔

دوسری جنوب مغرب کو جاتی ہوئی پسرور میں سے خم کھا کر جنوب کو چل دیتی ہے اور چکیاں گاؤں کے قریب گوجرانوالہ تحصیل میں چلی جاتی ہے۔جہاں ان دونوں شاخوں کی مزید شاخیں ہو جاتی ہیں۔پانی تقریباً سارا سال ہی رہتا ہے لیکن بارش کے حساب سے کم و بیش۔پانی کی رفتار تیز ہوتی ہے اور سیلاب کے دنوں میں عبور دشوار ہو جاتا ہے۔یہ نالہ میدانی علاقہ میں آ کر راستے بدلتا رہتا ہے۔لیکن تباہ کاریاں ظفر وال پسرور تک ہی زیادہ ہوتی ہیں جب کہ آگے نکل کر یہ آس پاس کی زمین کو زرخیز کرتا جاتا ہے۔پسرور کے جنوب میں اور رعیہ میں۔

موجودہ شاہراہ اعظم سے ہٹ کر دیک کی گذر گاہ پر ایک پل موجود ہے جسے پل شاہ دولہؒ کہتے ہیں۔پاس ہی ایک گاؤں بھی اسی نام کا موجود ہے۔لیکن اس پل کے بارے میں گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے گزیٹیر خاموش ہیں۔پل خان ولی اللہ صاحب کے مطابق لاہور سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔کامونکی سے ایک بل کھاتا راستہ اس پل تک چلا جاتا ہے اور فاصلہ دس میل کے لگ بھگ ہے۔پل کی لمبائی ۱۲۲ فٹ، چوڑائی ۲۴ اور اونچائی چار فٹ کے قریب ہے۔یعنی درمیان درجے کا ہے اور صاحب مضمون کا قیاس ہے کہ سرکاری توجہ اور اعانت سے تعمیر ہوا ہوگا۔

لیکن کوئی کتبہ یا تحریر اس سلسلہ میں راہنما نہیں ہے کہ یہ پل کب بنا اور کس نے بنوایا۔کرامت ناموں میں اسے شاہ دولہؒ صاحب کا کارنامہ قرار دیا گیا

ہے اور انہیں کے حوالے سے دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے اور چونکہ لکھنے والے دیک کے قریب و جوار کے نہیں تھے اس لئے مختلف گوئی قدرتی امر تھا۔ایک اور جگہ مرقوم ہے کہ سیالکوٹ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر موضع پور منڈل سے جہاں مہادیو کا استھان ہے ڈیک نالہ نکلتا ہے ویسے دیک کے محل وقوع کے بارے میں نہ تضاد ہے نہ غلط گوئی۔جگہ، سمت اور فاصلہ کا جو اختلاف ہے وہ زیادہ عجیب نہیں ہے۔عجیب بات یہی ہے کہ کسی لکھنے والے کی تحریر سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ پل کب بنا اور کس نے بنایا۔اور جو جگہ ان کا ٹھکانہ نہ رہی وہاں پل ان کے نام سے کیسے وجود میں آ گیا۔

سیالکوٹ گزیٹیر ہی میں آگے چل کر شہروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ امرتسر، لاہور، گورداسپور اور گوجرانوالہ کی سڑکیں ''ایک نالے'' پر آ کر ملتی ہیں جسے شاہ دولہ کے پلوں میں سے ایک کے ذریعے پار کیا جاتا ہے۔(اس جگہ پر) یہ پل پرانا بنا ہوا لگتا ہے اور خاصا مستحکم ہے۔حال ہی میں یعنی الحاق پنجاب کے بعد انگریزی دور میں (جب گزیٹیر لکھا گیا تھا) اس میں ایک محراب کا اضافہ کیا گیا۔اسی ایک نالہ کے شمالی کنارے پر سیالکوٹ بسا ہوا ہے۔

پسرور کے ذکر میں بھی مرقوم ہے کہ یہ شہر ایک نہر کے ذریعے سیراب ہوتا ہے جو دیک سے کاٹ کر لائی ہوئی ہے۔اسی مقصد کے لئے کبھی دارا شکوہ نے بھی ایک نہر نکلوائی تھی۔اس نہر کے آثار اور اس پل کے جسے شاہ دولہؒ صاحب نے منسوب پل وہ نہیں تھا جو کامونکی کے قریب ہے اور جس پر بقول بعض شہزادہ معظم

نے تاجپوشی کی تھی بلکہ وہ پل ہوگا ''جو ایک نالہ'' پر اس جگہ بنا ہوا بتایا گیا ہے جہاں چار جانب سے راہیں آ کر ملتی بتائی گئی ہیں (سیالکوٹ گوجرانوالہ سے تقریباً شمال مشرق میں ہے اور قریب ترین پہاڑی علاقہ اسی طرف ہے۔تمام دریا اور نالے اُدھر ہی اِدھر کو آتے ہیں۔چناب وزیرآباد کے پاس سے اس ضلع کے باہر نکل جاتا ہے۔اور راوی پاس پھٹکتا تک نہیں۔

ڈیک۔ایک۔کھوٹ۔پلکو وغیرہ کئی چھوٹے بڑے نالے بھی سیالکوٹی علاقہ میں سے ہوتے ہوئے ضلع گوجرانوالہ میں سے گزرتے ہیں۔اول الذکر دونوں نالے بڑے ہیں اور دوسرے چھوٹ۔کھوٹ ایک سے نکلتا ہے اور ڈیک میں جا گرتا ہے لیکن ایمن آباد کے پاس سے گزرتا ہوا۔اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ کامونکی کے پاس جس پل کا ذکر ملتا ہے وہ اصل میں ڈیک کے اس معاون پر بنایا گیا ہوا پل ہو کیونکہ گوجرانوالہ گزیٹیر میں یہ بھی تحریر ہے کہ کھوٹ ضلع کی حدود سے آگے نکل کر ڈیک نالہ میں جا ملتا ہے ان تمام نالوں کے جگہ نام بھی بدل جاتے تھے اور ان سب کو ڈیک کا ایک ہی نام دیا جاتا تھا۔) یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ڈیگ پر پسرور کے نواح میں بنا ہوا کوئی پل ہو۔

یہ دونوں جگہیں سیالکوٹ کے بہت قریب تھیں اور سیالکوٹ ہی میں شاہ دولہؒ صاحب کا قیام بتایا گیا ہے یا پھر اس کے نواح میں جس میں پسرور کا علاقہ شمار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن معمہ پوری طرح ان حوالوں کے باوجود حل نہیں ہوتا کہ ان دونوں جگہوں پر شاہ دولہؒ صاحب نے کب پل بنوائے اور کیوں۔کیوں کا جواب ہر چند رفاہ

عامہ کے جذبہ میں مل سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس جذبہ کے بروئے کار آنے کے محرکات کیا تھے۔ کیا وہ جگہیں ان کی اقامت گاہوں کے قریب تھیں۔ کیا وہ کنار آب ٹھکانے بنانے کے عادی تھے جیسا کہ کرامت نامہ میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی دیوار قیاسات پر ہی کھڑی کی جاسکتی ہے تاوقتیکہ کسی گوشے سے آپ کی زندگی کے بارے میں کوئی جامع قلمی نسخہ کہیں سے حاصل نہ ہو جائے۔

انہیں ایام میں سیدن نامی ایک فقیر وارد گجرات ہوا اور اس نے دعوی کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس شہر کا سربراہ مقرر کیا ہے اور مقصد یہ تھا کہ شاہ دولہؒ کے اقتدار کو ٹھیس پہنچے۔ آپ نے باطنی وسائل ہی سے اس نام نہاد پر واضح کر دیا کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے اور وہاں سے یوں غائب ہوا کہ پھر کبھی کہیں اس کا نام تک نہ سنا گیا۔

ان ایام میں راجور کے اندر جواب ریاست جموں کا ایک حصہ ہے دختر کشی کا رجحان بہت عام تھا۔ راجور کا راجہ چتر سنگھ شاہ دولہؒ صاحب کا دلی عقیدت مند تھا۔ لیکن اس کے ہاں جب بھی بچی ہوتی وہ اسے مار ڈالتا۔ لیکن ایک لڑکی کی پیدائش پر شاہ دولہؒ صاحب نے اسے کہا کہ اس لڑکی کو زندہ رہنے دیا جائے۔ کیوں کہ وہ بڑی خوش قسمت ہو گی اور بادشاہوں کی ماں بنے گی۔ یوں وہ بچی بچ نکلی اور ایک خوبصورت جاذب دوشیزہ بن کر جوان ہوئی۔ کشمیر کے ایک سفر کے دوران جب شاہ جہاں کا راجور سے گزر ہوا تو راجہ نے یہ لڑکی شاہ کی نذر گزرائی۔ جسے قبول کر لیا گیا اور شہزادہ اورنگ زیب کو دے دی گئی جس نے اس سے شادی کر لی۔

بعد میں شہزادہ یہ جاننے کے لیے جب مضطرب ہوا کہ شاہ جہاں کے بعد داراشکوہ اور مراد میں سے کون تخت نشین ہوگا یا وہ خود تو وہ شاہ دولہؒ صاحب کے پاس حاضر ہوا اور اس نے شاہ صاحب کو مرغ زریں ایک ولایتی بلی اور چوبی عصاء پیش کئے ۔اس خیال سے کہ اگر شاہ دولہؒ صاحب نے عضاء لوٹا دیا اور دوسری چیزیں رکھ لیں تو اس بات کا اظہار ہوگا کہ تخت اس کو ملے گا۔شاہ دولہؒ صاحب نے جوں ہی شہزادے کو دیکھا اٹھ کر سلام کیا اور جلالت مآب کہا۔ایک روٹی شہزادے کو دی ۔عصا لوٹا دیا اور کہا ''روٹی خدا نے تمہارے لیے بھیجی ہے ۔اور یہ عصاء تمہیں تمہارے با اختیار ہونے کی علامت کے طور پر دیا جاتا ہے ۔خوش دل رہو۔''اورنگ زیب نے بیگم بائی کو یہ داستان سنائی جس نے اپنے بارے میں شاہ دولہؒ صاحب کی پیش گوئی سنا کر کہ وہ بادشاہوں کی ماں ہوگی ۔شہزادے کے اعتقاد کو اور پختہ کر دیا۔

بیگم بائی کے بیٹوں معظم اور محمود میں سے اول الذکر بہادر شاہ بادشاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب نے پھر شاہ دولہؒ صاحب کو بلا بھیجا جو معجزانہ انداز میں شاہ کے پاس آن پہنچے ۔شہنشاہ اس وقت تنہا کھانا کھا رہا تھا۔لیکن اس نے دیکھا کہ ایک اور ہاتھ بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہے ملازموں کو بلا کر اس سے ان کو اس آگاہ کیا اور کہا کہ وہ ہاتھ کسی عمر رسیدہ آدمی کا ہاتھ لگتا ہے جس کی دوسری انگلی کوئی نہیں ہے ۔بختیاور نامی ایک خادم نے کہا کہ وہ ہاتھ غالباً شاہ دولہؒ صاحب کا ہے ۔اس پر شہنشاہ نے آپ کو بلا بھیجا

۔جس پر شاہ دولہؒ صاحب اسی وقت ظاہر ہو گئے اور حیرت زدہ حکمران نے زرومال دے کر آپ کو رخصت کیا۔

شاہ دولہؒ صاحب کی کرامات کے بارے میں بہت سی داستانیں بیان کی جائی ہیں ۔لیکن جو کرامت ان سے خاص طور پر منسوب ہیوہ چوہوں والی کرامت ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کی دعا سے پیدا ہوتے کوتاہ سروالے ،لمبے کانوں والے اور چوہوں جیسے چہرے والے ہوتے ہیں اور بولنے یا سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل عاری۔

شاہ دولہؒ صاحب نے بڑی عمر پائی جو عام طور پر ۱۵۰سال بتائی جاتی ہے۔آپ اکبر، جہانگیر،شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے ہم عصر تھے ۔آپ کی پیدائش اکبر کے پچیسویں سال جلوس میں (۹۸۹ بمطابق ۱۵۸ء)ہوئی اور ''خدا دوست کے تاریخی اعداد کے مطابق آپ کا وصال ۱۰۸۷بمطابق ۱۶۷۶ءکو ہوا۔ یوں آپ کی عمر حقیقت میں ۹۵ سال بنتی ہے۔

آپ کو شاہ دولہؒ دریائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ان بے شمار پلوں کے باعث جو آپ نے تعمیر کیے ۔آخری ساعات زندگی تک امراء شاہزادے متمول اور نادار لوگ ایک سی عقیدت کے ساتھ دعا لینے کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ۔آخر جب آپ نے وقت مرعودہ قریب آتے محسوس کیا تو آپ نے اپنے چیلے بھاون شاہ کو بلا بھیجا۔اسے دستور کے مطابق دلق عطا کی اور اپنا سجادہ نشین اور جانشین مقرر کیا۔

شاہ دولہ" فرقہ کے موجودہ لوگوں کا کہنا ہے کہ بھاون شاہ ان کا بیٹا تھا اور وہ اس کی اولاد ہیں۔ بھاون شاہ آپکا بیٹا ہو یا متبنیٰ یا بالکا یہ ضرور ہے کہ موجودہ پیر بھاون شاہ کی اولاد ہیں۔

شاہ منور علی صاحب نے اپنی تالیف ''فقر العفیف'' میں تحریر کیا ہے کہ۔

اٹھائیس برس کی عمر میں بتاریخ اکیسویں ماہ ذوالحجہ ۱۹ھ بروز یک شنبہ بعد مغرب سید عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر بیعت توبہ سے مشرف ہو کر بائیس برس وضو کرانے کی خدمت پر مامور رہا۔ بتاریخ ۲۷/ماہ شوال ۵۴۱ھ بروز چہار شنبہ وقت ظہر کے حضرت ممدوح کو وضو کرا رہا تھا۔ میں نے عرض کی یا حضرت آب حیات کی کیا کیفیت ہے۔ جس کو نوش کرنے سے حضرت خضرؑ کو حیات ابدی حاصل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے ایک جرعہ آب سیدھے ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا۔ اس وقت فقیر کے ہاتھ میں ساڑھے چھ سو برس کی عمر کا آب حیات ہے تو نوش کر لے۔ میں نے اسی وقت نوش کر لیا۔ اس وقت میری عمر ۵۰ سال کی تھی ...... الخ

''بتاریخ نویں ماہ ذی قعد ۵۴۸ھ بروز دوشنبہ وقت عصر سے حسب حکم جناب ممدوح حضرت کبیر الدین شاہ دولہ صاحب گجراتیؒ کی خدمت میں سرگرم عمل رہا۔ پھر قطب الا سرار شاہ دولہ گجراتیؒ نے مجھے بتاریخ سترھویں ماہ ربیع الاوّل ۵۸۷ھ بروز دوشنبہ بوقت عصر بیعتِ خلافت ارشاد سے مشرف کیا۔''

یہ واقعہ شیخ عبدالقادر کے وصال کے سولہ برس بعد کا ہے۔ شیخ کا وصال سترھویں ماہ ربیع الثانی ۵۷۱ھ کو قبل از نماز جمعہ ہوا۔

# شاہ دولہؒ کے چوہے

حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ بلاشبہ ایک مادر زاد ولی کامل تھے اور آپ کا فیض روحانی تا حال جاری و ساری ہے بلکہ اس فقیر کا تو یہ عقیدہ ہے کہ آپ کا فیض با کمال روز قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ آپ کی یہ بھی کرامت ہی ہے کہ آپ کا فیض جاری ہے۔ مگر آپ کی ایک کرامت ایسی بھی ہے جو کہ آپ کی شہرت کی وجہ بن چکی ہے۔

دنیائے اسلام میں یوں تو کئی ایک مسالک اور کئی ایک فرقے معرضِ وجود میں آ چکے ہیں اسی طرح ابتدائے اسلام سے لیکر تا دمِ تحریر لاتعداد اولیائے کاملین بھی امتِ مسلمہ کی تربیت کے لیے آئے ہیں مگر کسی ایک میں بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی ہے کہ اس کے عقیدت مندوں کو دور سے دیکھ کر ہی پہچان لیا جائے کہ یہ شخص کسی خاص پیر سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ خصوصیت ہمیں صرف اور صرف شاہ دولہ علیہ الرحمتہ کے ماننے والوں اور فیض حاصل کرنے والوں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ ہم انہی مخصوص لوگوں کو ہی ''شاہ دولہ سرکار کے چوہے'' کہتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر کیا ایسے لوگ خطہء پنجاب کے ایک شہر یا پھر صرف پاکستان ہی میں ہوتے ہیں اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ ایسے سروں والے تو ہر ملک میں اور ہر قوم میں ہی دیکھے جا

سکتے ہیں۔

اس ضمن میں انڈین انکوائری کے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ شاہ دولہؒ صاحب کے چوہوں کے سلسلہ میں اور خود شاہ دولہؒ صاحب کے بارے میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ چوہوں گجرات کے معروف ولی کی کرامت قرار دیا جانا پس مرگ ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ شاہ دولہؒ کے مزار کا (متولی) بھاون شاہ اس اعتقاد کا خالق تھا بالکل اسی طرح جس طرح غازی سلطان محمود اب اسی درگاہ کے حوالے سے اس گجرات کے بڑے ولی کے مزار کے گرد پیدا کر رہا ہے۔ تمام کوائف اسی صورت حال کی طرف لے جاتے ہیں۔ یعنی اس اعتقاد کا زیادہ قدیم نہ ہونا۔

یہ حقیقت کہ فقیروں کا ایک سلسلہ ہے جو نواحی کوتاہ سروں کے طبقہ کے ذریعے روٹی کماتا ہے۔ اور ایک اہم درگاہ کی اس ضمن میں موجود ہونے کی سہولت۔ نیز یہ کہ اس دستے کا املاک زرعی سے اور جانشینی کے کسی مسلمہ حق سے محروم ہونا۔ اور یوں بسر اوقات کا سارا دارو مدار صرف اسی کمائی پر ہونا اور اس کا خوددار مدار خوش عقیدہ لوگوں کی ضعیف الاعتقادی پر ہونا۔ یہ سب باتیں مل جُل کر اس خیال کو تقویت دیتی ہیں کہ بھاون شاہ نے معروف اور طویل العمر مرد مقدس کی وفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد بعد ہی پیروکاروں کے اس غیر مقدس کاروبار کا سلسلہ عقیدہ سے جوڑ دیا۔ اس طرح حاصل ہونے والی کمائی کا بٹوارا بالکل اسی ڈھب کا ہے جیسا کہ کسی انجمن سے توقع کیا جا سکتا ہے جس کے پاس مجتمع رہنے کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو ماسوا اس کے کہ وہ روزی کمانے کے عام وسائل سے فائدہ اٹھائے۔

جہاں تک شاہ دولہؒ کی داستان کا تعلق ہے اس کا ولادت کی رُو سے براہ

راست اپنے عہد کے بڑے لوگوں سے سلسلہ ملا دیا گیا ہے حالانکہ وہ ایک مقابلی خدا یاد انسان تھا اور یہ بات اس دور کا معمول تھی ۔ لیکن اسی سے واضح طور پر داستان کے بارے میں شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں اور کراماتی قوتوں کا پنجابی اولیاء سے منسوب ہونا عام بات ہے۔ اس داستان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بڑی آسانی سے داستان گوؤں نے ملک میں چاروں جانب دوسرے اولیاؤں کے بارے میں پھیلی ہوئی داستانوں میں سے اپنا نہ لی ہوں۔

بلاشبہ سترہویں صدی میں گجرات شہر میں ایک روحانی آدمی رہتا تھا جو طویل عمر پا کر وہاں ہی فوت ہوا۔ اس کا مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا اور جسے بہت احترام نصیب ہوا۔ عین ممکن ہے کہ اپنے نواح میں رفاہ عامہ کے کاموں کو بڑھاوا دینے میں اس کا ہاتھ رہا ہو۔ غریبوں اور محتاجوں کی حاجت روائی میں وہ مبالغہ کی حد تک مشہور ہو گیا ہو۔ اس نے بڑی اچھی زندگی بسر کی اور آس پاس کے شرفا و امراء اس کا احترام کرتے تھے۔ گجرات شہر کے محل وقوع کو سامنے رکھتے ہوئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس نے شاہ جہاں اور اسکے درباریوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا ہو۔ اور ان متعدد سفروں کے دوران جو کشمیر اور دربار شاہی کے مابین آتے جاتے ہوئے اختیار کیے گئے۔

لیکن یہ سب باتیں اس کے لئے بنیاد نہیں بنتیں کہ ہم فرض کر لیں کہ ان بے چارے مسلوب الحواس لوگوں سے اس کا کوئی ذاتی واسطہ یا تعلق تھا جن کو آج فقیروں کا وہ دستہ ، سلسلہ یا فرقہ جس نے اپنے آپ کو اس کے نام سے وابستہ کیا ہوا ہے، اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔ چوہوں کے متعلق اس بات کا بھی امکان ہے کہ بعض اضلاع کی آبادی میں اس قسم کے حواس باختوں کی پیدائش کا رجحان

پایا جاتا ہو مثلاً جموں اور پونچھ میں ۔ لیکن یہ شک کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جن کی گذران ان پر ہے ان لوگوں کی خوش بسری کے لئے ممکن ہے کہ بعض بدنصیب بچوں کو جو طبعی طور پر پیدا ہوئے ہوں غیر طبعی طور پر بعد میں ایسا بنا دیا جاتا ہو۔ جو خود غرض لوگوں کے لئے ناممکن نہیں ہے۔

شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کے چوہے اگرچہ انکو چوہے کہنا انسانیت کی توہین ہے کیونکہ یہ انسانوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں اور انسانوں میں ہی رہتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کو عرفِ عام میں یہی کہہ کر پکارا جاتا ہے تو یہ عاجز بھی یہی لکھنے پر مجبور ہے ۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے تو یہ فقیر عرض کر رہا تھا کہ یہ لوگ چھوٹے سروں کے حامل ہوتے ہیں۔

چونکہ ان لوگوں کے سر بالکل چھوٹے ہوتے ہیں چنانچہ ان کی دماغی کیفیت بھی معمولی نوعیت ہی کی ہوتی ہے ۔ یہ لوگ عام طور پر گفتگو کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہ لوگ سوچنے سمجھنے سے بھی عاری ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ کسی حد تک ذہنی طور پر ماؤف بھی ہوتے ہیں۔ ان کو کسی بھی قسم کی مدافعت کرنے سے معذور خیال کیا جاتا ہے ۔ یعنی اگر ان کو کسی خطرہ سے بچانے یا خود کو بچانے کے لیے کہا جائے تو یہ نہیں کر سکتے ۔

ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ لوگ جنسی طور پر بھی بالکل کورے ہوتے ہیں چنانچہ یہ تاثر بھی بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی نسل ہے جس کے افراد ایسے چھوٹے سروں والے ہوتے ہیں ۔ ان لوگوں کو جو لوگ بھی سنبھالتے ہیں یا ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں ان کی باتیں یہ سمجھ لیتے ہیں اور ان کے اشارے بھی یہ جان لیتے ہیں ۔

ذہنی طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ یہ کسی بھی عمر کے ہو جائیں خود کو بچہ ہی تصور

کرتے ہیں مگر ان کو اگر سکھایا جائے تو یہ لوگ کھانا پینا اور کپڑے پہننے کے علاوہ رفعِ حاجت کے طور طریقے بھی سیکھ لیتے ہیں عام طور پر ایسے لوگوں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ یہ مخصوص لوگ شاہ دولہ صاحبؒ کے مجاورین کے قبضے میں ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ بھیک منگواتے ہیں۔ کسی حد تک یہ بات دوست بھی ہے کہ بعض اوقات ایسی صورت حال دیکھنے میں بھی آتی ہے۔ مگر کیا ایسے بچے گجرات میں شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کے آستانہ عالیہ کے علاوہ اور کہیں نہیں تو یہ بات غلط ہے کیونکہ ایسا بچہ تو کسی کے بھی گھر پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ بات بھی بالکل سچ ہے کہ ان بعض مفاد پرست شاہ دولہ سرکار کے چوہے کہہ کر ان کے توسط سے بھیک مانگتے ہیں مگر لوگ ان لوگوں کیوجہ سے تو ان کو بالکل بھی بھیک نہیں دیتے بلکہ ان کے پیشِ نظر ایک ولیِ کامل کی شخصیت اور ان کے روحانی کمالات اور ان کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی حد تک خوفِ خدا بھی ہے کہ کہیں خدانخواستہ ان کے گھر میں بھی ایسا بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کو بھیک دیتے وقت مقام تشکر بھی لوگوں کے اذہان و قلوب میں ہوتا ہے کہ یا رب العالمین تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں اور ہمارے بچوں کو ایسا نہیں بنایا۔

اس فقیر اور مسکین کا بھی یہی خیال ہے کہ ان مظلوم لوگوں کی ہرزہ سرائی نہ کی جائے اور ان کا تمسخر نہ بنایا جائے بلکہ ان کے ساتھ محبت اور لگاوٹ کا اظہار محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔ آپ یقین جانئے کہ ایسے بچے خود تو ہین بن گئے یا بن جاتے ہیں۔ یہ تو ان کی تقدیر کا حصہ ہے۔ ہمیں یقیناً شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے ہمیں اس حال سے محفوظ و مامون

رکھا وگرنہ بھلا اس کے کارخانہ قدرت میں ہماری اوقات ہی کیا ہے۔ بلکہ اس عاجز کا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں تو شکر ادا کرنے کا بھی درست سلیقہ نہیں معلوم ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دوسرے اولیائے کرام کی طرح حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمۃ بھی عورتوں کو اولاد کی نعمت سے بفضلہٖ تعالیٰ نواز سکتے ہیں۔ مگر ان کی دعا سے جب کسی کے ہاں بچوں کی پیدائش شروع ہوتی ہے تو پہلا بچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی نے منت مانی کہ پہلا بچہ جب ہو گا تو اس کو دربار پر چھوڑ دیا جائے گا مگر وہ جب نہیں چھوڑتا تو آئندہ پیدا ہونے والے بچے اسی مخصوص شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ منت پوری نہ کی جائے۔

اس عاجز کے خیال میں یہ دونوں نظریات غلط ہیں کیونکہ کوئی بھی ولی کامل ایسی سخت شرط عائد نہیں کر سکتا کہ بچوں کی پیدائش تو شروع ہو جائے گی مگر پہلا بچہ ایسا ہو گا۔ اب آپ خود سوچئے کہ ایسے بچوں کا بھلا کوئی کرے گا کیا۔ نہ ایسے بچے کام کاج کرنے کے قابل نہ ہی بولنے کے قابل تو پھر ایسی شرط ہی کیوں رکھی جائے گی۔

یہ فقیر عرض کرتا ہے کہ جہاں تک میرے علم میں ہے کہ اولیائے کاملین تو لوگوں کے دکھ درد کو دور کرنے اور ان کو معذوردی سے صحت یابی کی طرف لاتے ہیں پھر بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمۃ نے ایسی کڑی شرط لگا دی ہو۔

ہاں مگر ایسا تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی حیات مبارکہ میں ایسے سروں والے

بچوں کو آپ نے بے یار و مددگار گھومتے پھرتے دیکھا ہو تو آپ نے اپنے مریدین سے فرمایا ہو کہ ایسے بچوں کو جمع کر کے ہمارے ہاں لے آؤ ہم ان کی نگہداشت کریں گے۔ چنانچہ آپ کا آستانۂ عالیہ ان مجبور اور بے کس لوگوں کا مسکن بن گیا ہو۔ جہاں ان کو کھانے پینے اور پہننے کے علاوہ رہنے کے لیے جگہ بھی میسر آ گئی۔

ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بہت ہی مفید اور سیر حاصل تحقیق جناب محترم پروفیسر شریف گنجاہی صاحب کی معلوم ہوتی ہے جو کہ آپ نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 45 تا 53 پر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔

جدید طب اسے خوردسری کا روگ کہتی ہے اور ایسے بچوں کے لئے مائیکرو سفلک کی اصطلاح کا ایک سات سمندر پار کی زبان میں موجود ہونا اپنی جگہ پر اس بات کی دلیل ہے کہ اس قسم کے چھوٹے سر والے بچے دنیا بھر میں ہر کہیں پیدا ہوتے آئے ہیں اور بغیر کسی منت ماننے کے۔ یہ بھی درست ہے کہ خلاصۃ التواریخ اور مآثر الامرا میں ہی نہیں بلکہ کرامت ناموں میں بھی کہیں اس کا اشارہ نہیں ملتا کہ کسی عورت کے بطن سے آپ کی دعا کے نتیجہ میں کوئی ایسا عجیب الخلقت بچہ پیدا ہوا ہو اور وہ اسے وہاں چھوڑ گئی ہو۔

یہاں تک کہ حقیقت گلزار صابری میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا جو اسی ہجری صدری کی تصنیف ہے۔ سب سے پہلے ہمیں خزینۃ الاصفیاء میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''اگر کسے بے اولاد برائے حصول اولاد بخدمت دے استدعائے دعا بجناب کبریا کردے فرمودے اگر پسر کلان خود نذر ما کنی اولاد از درگاہ خالق حقیقی بتو عطا خواہد شد۔ سائل قبول می کرد پسر اول کہ بخانہ اس پیدا شدے اور اچند علامات می بود۔ اول: سر او خورد بودے۔ دوم: گنگ بے زبان۔ سوم: مجذوب مسلوب الحواس

اوراس کے بعد ایلیٹ سمیت دوسرے لکھنے والے لوگوں نے بھی اسی بات کو اپنے اپنے انداز میں کمی بیشی کرتے ہوئے دہرادیا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایسے مسلوب الحواس بچوں کو مزار پر چھوڑ جانے کا سلسلہ پرانا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ لنگر کا وہ پہلا نظام بعد میں نہیں رہا تھا اس لیے مجاور انہیں بھیک مانگنے والوں کو سال سال دو دو سال کے لیے ٹھیکے پر دے دیا کرتے تھے اور ٹھیکے پر لے جانے والے اکثر خدا خوفی سے خالی ہوتے تھے لیکن یہ مسئلے کا عمرانی اور معاشرتی پہلو ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان بچوں کو دعا کا نتیجہ ماننے کی بات کتنی پرانی ہے اور اگر خود شاہ دولہؒ صاحب کے دورِ حیات سے وابستہ ہے تو کیوں کسی کرامت نامہ میں یا عصری تحریر میں اس کا اشارہ نہیں ملتا۔

جہانگیر نے تزک میں برصغیر کی ہر عجیب سے عجیب بات کا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن گجرات میں سے گزرنے کے باوجود حیرت ہے کہ اسے خبر تک نہ ہوئی کہ یہاں ایک ایسا درویش بھی رہتا ہے جس کی دعا سے خوردسر بچہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اُسے اپنے سایہ شفقت میں لے لیتا ہے۔ شاہ جہاں نامہ اور وقائع عالمگیری ایسے تذکرے بھی اس حیرت انگیز کرامت کے ذکر سے خالی ہیں۔ برنیر ایسے غیر ملکی سیاح بھی اس منفرد حقیقت کو اپنے سفر ناموں اور اپنی یادداشتوں کا حصہ نہ بنا سکے۔

آپ کے وقت موعود کے آجانے کا ذکر بیشتر اربابِ قلم وعقیدت نے کیا ہے اور اس ضمن میں بھاون اور اس کے متقبل کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن ان مسلوب الحواسوں کے مستقبل کے بارے میں ایک فقرہ بھی کسی روایت کا حصہ نہیں تھا جن کو ان کے ماں باپ آپ کی کرامت کے آگے سرخم کرتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں وہ رویہ گوارا نہیں کر سکتے تھے جو اخلاف کے

ہاتھوں ان کا مقدر بنتے ہوئے میری عمر کے اکثر ان لوگوں نے دیکھا ہے جن کا دربار اور حوالی دربار سے واسطہ رہا ہے۔

اگرچہ یہ بھی اسی قدر حقیقت ہے کہ سجادہ نشینوں میں سے متعدد گھر ایسے تھے جنہوں نے اس کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عقدہ مشکل کی کشود ممکن نہیں ہے۔ میرے اپنے آشناؤں میں ایک خاندان خورد سروں کا تھا لیکن نہ صرف یہ کہ ان کے ماں باپ میں سے کسی نے ایسی کوئی دعا نہیں مانگی تھی بلکہ وہ تمام افراد خانہ زندگی کے تمام وظائف میں حصہ لیتے رہتے اور سرکاری ملازمت کا ذائقہ بھی ایک آدھ نے چکھا۔ اسی طرح خوردربار کے حوالی ہی میں ایک ہی خاندان کے ہاں اسی شکل وصورت کا بچہ پیدا ہوا لیکن ماں باپ نے اسے متولیوں کے سپرد کرنے کے بجائے اپنے پاس ہی رکھا۔ اور وہ معاشرے کا ایک فرد بن کر زندہ رہا۔ خوردسری کے باعث یہ ضرور ہے کہ ایسے افراد میں وہ ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی جو عام انسان میں ہوتی ہے پھر بھی ان سے بیشتر کو تربیت کے ذریعے عضو معطل ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر بعض کے دعا کے نتیجہ میں ایسے بچے پیدا نہ ہوتے تو ان کو دربار پر چھوڑ جانے کا رواج نہ پڑتا۔ اسی سے پھر وہ سوال ایک خلش بن کر ابھرتا ہے کہ اس شکل وصورت کے بچے کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں۔ راقم الحروف کو اپنی افتادہ طبع کے مطابق یہ ماننے میں تامل ہے کہ شاہ دولہؒ صاحب نے خود اپنے دور کے لوگوں کو اس نہایت کڑی آزمائش میں ڈالا ہو گا۔ اسی لیے میری طرح بہتوں کا جب اس قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اس تاویل کی جانب نکل جاتے ہیں کہ اپنی رحم دلی کے باعث آپ نے ایسے بچوں کے لیے اپنی آغوش وا کر دی ہو گی جو ماں باپ

کے لیے اپنی عجیب الخلقتی کے باعث بار ثابت ہوتے ہوں گے او چل چلاؤ کے اس دور میں جب تاختو تارج زندگی کا معمول تھا جن کو ساتھ رکھنا یا ساتھ لے جانا کٹھن کام تھا۔اس مجبور سنگدلی کا تجربہ ایسے بیشتر خاندانوں کو تقسیم برصغیر کے وقت بھی ہوا ہوا گا اور خود مجھے ایک عزیز نے بتایا کہ جب وہ لوگ واہگہ پار سے ادھر کو عازم ہوئے تو ماں نے ایک بچی کو حالات کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے راہ میں چھوڑ دیا لیکن جب وہ رونے لگی تو اس کی بڑی بہن نے جو خود بھی بہت بڑی نہیں تھی پسیج کر اسے اٹھا لیا اور یوں وہ بچی سلامت پاکستان آ پہنچی ورنہ افراتفری اور نفسا نفسی کی صلیب پر لٹک کر جانے کس انجام کو پہنچتی۔

ذہن کو یہ بات اپیل ضرور کرتی ہے اور چراغ قادری کا یہ جملہ اسے تقویت بھی دیتا ہے کہ ''جنین مجذوب و بے ہوش کہ از خورش و نوش خبر نداشتند پس و پیش ایشاں می نشستند'' لیکن مسلوب الحواسوں کا سہارا بننا اور چیز ہے اور ایسے بچوں کے عالم وجود میں آنے کا باطنی وسیلہ بننا اور چیز ہے۔پتہ نہیں چلتا کہ عوام میں یہ عقیدہ کیوں کر پختہ ہو گیا کہ اگر بے اولاد شاہ دولہؒ صاحب کے توسل سے اولاد چاہیں گے تو اولاد کا پہلا فرد ایک عضو معطل بن کر اس دنیا میں آئے گا جبکہ عملاً ہر بار یوں نہیں ہوا۔اس پہلو پر میں بارہا سوچا ہے۔کبھی کبھی خیال آیا کہ ممکن ہے کہ شاہ دولہؒ صاحب خود بھی نسبتاً چھوٹے سر کے ہوں اگرچہ اس قدر چھوٹے سر والے نہیں جیسے کہ چڑھاوا چڑھنے والے معذور بچے اور ضرورت مند بے اولاد عورتیں ان کے توسل سے اولاد کی آرزو کرنے کے بعد اس عقیدہ کے زیر اثر کہ آپ کی دعا سے ان کی گود ہری ہو جائے گی ان کی صورت کو تصویر میں رکھتی ہوں گی اور یوں بعض کے ہاں اسی حلیہ کا بچہ پیدا ہو جاتا ہو گا جسے اسی عقیدہ کے

زیر اثر کہ یہ آپ کی دعا کا ثمر ہے ان کی نذر کر دیتی ہوں گی۔ لیکن چراغ قادری نے آپ کا جو حلیہ مبارک بیان کیا ہے وہ میرے اس خیال کا بھی نفی کر جاتا ہے اور آپ کی برٹش میوزیم والی تصویر بھی اور میں سوچتا ہوں ممکن ہے کسی ایک عقیدت مند نے دعا کی ہو کہ اگر مجھے خدا بے ثمری کے روگ سے رہائی دے تو میں پہلا بچہ خدمت گزاری کے لیے درگاہ پر چھوڑ دوں گا اور وہ بچہ اتفاق سے اس شکل کا پیدا ہو گیا اور یوں ایسے چڑھاووں کا رواج پڑ گیا۔ لیکن یہ سب قیاسات ہیں اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا علمی اور تاریخی طور پر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکنے کے بعد میں نے پچھلے دنوں یہ راہ اختیار کی کہ ایسے بعض معذوروں کے والدین اور ان کو ساتھ لے کر گدائی کرنے والوں سے رابطہ قائم کیا اور اخذ معلومات کی۔ میرے اس تجسس کا حاصل بھی یہی نکلا ہے کہ بیشتر نے اس سے انکار کیا ہے کہ انہوں نے منت مانی تھی اور استجاب دعا ان کے بچوں کے اس شکل میں پیدا ہونے کا باعث بنی۔ کیونکہ بعض ماں باپ کے وہ دوسرے یا تیسرے بچے تھے۔ خود مشتاق رام کر کے کرامت نامہ میں ہے کہ جن دنوں آپ ڈیک پر پل تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ ''دراثنا راہ بموضع رام رایاں قدرے آرمیدند۔ در آنجا یک مسماہ دہقانہ آمدہ داند کے قند بنذر حضرت گذرانیدہ بر پائے حضرت افتادہ عرض نمود کہ دو سہ فرزندان و دختران زائیدہ بودم ہیچ یکے سلامت نماندواکنوں کے کہ بامرالیہ خشک شداز فضیلت امید دارم کہ فرزند بخشی۔'' حضرت نے رحم کھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا خدا تجھے پھر طراوت و نضارت بخشے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن وہ بچہ چار سال کا ہو جانے کے باوجود کرامت نامہ لکھا ہے کہ تکلم سے محروم (یہ نہیں لکھا کہ خوردسر تھا) اور یہ محرومی بھی آپ کے فیض سے جاتی رہی۔

علمی اور طبی حوالے سے اس موضوع پر الحاق پنجاب کے جلد بعد ہی انگریزوں نے توجہ دینی شروع کر دی تھی جس کا ماحصل آثار ہند ( Indian Antiqrery ) کے اس صدیعشرہ اول کے شماروں میں موجود ہے ۔اس وقت سے لے کر اب تک طب جدید بہت ترقی کر گئی ہے ۔اور رحم مادر میں رونما ہونے والا خلاف عادت صورتوں کے اسباب پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ایکس ریز کی سہولتوں نے اس تجسس اور تحقیق کی راہ میں مزید آسانیاں پیدا کر دی ہیں ۔خوردسری کے روگ کے مادی اسباب کا بھی کافی حد تک پتہ لگالیا گیا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں ۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کی شائع کردہ کتاب "Cell Biology" میں Microcephalogy کے بارے میں اظہار کئے گئے خیالات کو پیش کرتا ہوں۔

تولید و توارث سے تعلق رکھنے والے جسمیوں Chromosomes میں (جو جوڑا جوڑا ہوتے ہیں ) جب ایک تیسرا آ شامل ہوتا ہے تو اس سے سہ زوجی Trisomy صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مرکزی نظام عصبی متاثر ہو کر دماغی نقص کا باعث بنتا ہے یہ سہ زوجی اگر اکیسویں جوڑے میں پیدا ہو تو اسے منگولزم کہتے ہیں جس سے ذہنی بے ارتقائی اور مرکزی نظام عصبی کے ناقص نمو مراد ہے ۔اسی طرح پانچویں جوڑے کے ایک کروموسوم کے کسی حصے کا نقصان پذیر ہو جانا بچے کو خوردسر کر جاتا ہے۔

اسی طرح ماڈرن امبرائیلوجی ”میں ڈاکٹر لینگ مین نے اس نقص کے بارے میں چوتھے ایڈیشن کے صفحات ۱۰۴۔۱۰۵۔۱۰۷۔۱۲۹ پر جو کچھ لکھا ہے اسکا ماحصل بھی یہی ہے کہ جنین جب رحم مادر میں ہرپس سمپلکس Herpes

Sumplex وائرس کی زد میں آتا ہے تو بچہ خود سر ہو جاتا ہے۔اسی طرح روغن ٹے جن کا زیادہ مقدار میں دینے سے بھی یہ رگ پیدا ہو جاتا ہے۔ہیروشیما اور ناگاساکا میں جب ایٹم بم پھٹا تھا تو اس وقت بھی زندہ بچ رہنے والی حاملہ عورتوں میں سے پچیس فیصد کے بچے خوردسری اور ذہنی درماندگی کا شکار ہو گئے تھے۔علم الارحام سے متعلق بیشتر کتابیں تصدیق کرتی ہیں کہ رحم مادر کے اندر کسی بچے کے خوردسر رہ جانے کا باعث بعض وائرس ہوتے ہیں اور ماں کا مرگی کا مریض ہونا بھی جہاں جنین میں اور کئی قسم کی خلاف عادت تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے وہاں خوردسری کے روگ کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

لیکن اس طبی توجیہ کے باوجود اگر ہم طب جدید کی بیان کی گئی ان باتوں کو بھی سامنے رکھیں کہ نفس انسانی جسم انسانی کو متاثر کرتا ہے اور خود نفس انسانی کو سمعی بصری ذرائع سے اس تک پہنچی ہوئی کسی ایسے انسان کی بات جس کے ساتھ اسے جذباتی لگاؤ ہو متاثر کرتی ہے تو یہ ماننے کی گنجائش نکل آتی ہے اور گنج کا وان بادیہ طب کی دعوت تحقیق دیتی ہے کہ ممکن ہے کسی محروم اولاد عورت کا یہ اعتقاد کہ شاہ دولہؒ صاحب کے مزار پر جا کر دعا مانگنے سے اس کی شاخ حیات پر پھل لگنا شروع ہو جائے گا اور پہلا پھل اس کے کام کا نہیں ہو گا اس کے اندر ایسی کیمیائی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہو جس کے نتیجے میں ایک طرف تو اس کے اندر تولیدی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہو اور دوسری طرف جب اسے احساس ہونے لگتا ہو کہ اس کی دعا سُنی گئی ہے تو جنین کے اندر وہ صورت حال از خود پیدا ہو جاتی ہو جو کسی وائرس کے سبب علم الارحام کے ماہرین کے خیال کے مطابق جنین میں پیدا ہو کر اسے خوردسر بنا جاتی ہو۔

کیونکہ وائرس جنین کو کوئی حکم نہیں دیتے اور نہ ان کو خود اس کی طلب ہوتی ہے کہ وہ کسی بچے کو شکم مادر میں خورد سر کر دیں اور کسی کو بزرگ سر۔ یہ تو جنین تک ان کی رسائی کے بعد اور وہاں ان کے اپنے آپ کو "آباد کارانہ حقوق" حاصل ہو جانے یا حاصل کرنے کی کوشش کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی ترکیب عناصر میں جو تبدیلی محض مادی اسباب سے ممکن ہو جاتی ہے جن کی ایک صورت وائرس ہیں وہ خالص غیر مادی اسباب سے بھی ممکن ہو سکتی ہے جس کی صدیوں سے زیر عمل آنے والی ایک صورت دعا مانگنا، دعا کروانا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے۔ وظیفہ یا دعا کی اثر آفرینی اب محض اہل مذہب کی خوش اعتقادی نہیں رہی اور سائیکو تھراپی اب ہر جگہ عام ہوتی جا رہی ہے۔

روس ایسے لادین ملک میں بھی اس کی شفائی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اس موضوع پر وہاں لکھی جا چکی ہیں۔ جن سے ک۔ پلاٹونوف کی کتاب The Word as a Physiological of Therepuatic Facter کا نام لینا ہی کافی رہے گا۔ اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ اہل تحقیق کے لیے یہ مطالعہ خاصا اہم ہے کہ جسم انسانی میں کلام کے ذریعے اعضاء کے افعال میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں یا پیدا کی جا سکتی ہیں مشہور روسی ڈاکٹر پاؤلوف کو سند مانتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ کسی آدمی کے منہ سے نکلا ہوا ایک بول دوسرے آدمی کے عصبی نظام کی سرگرمی اور وظائف پر اثر انداز ہو کر اس میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ کتاب کے صفحہ ۹۶ پر ایک اکیس سالہ عورت کی مثال دی گئی ہے جس کی کھوئی گئی سماعت کو دوا کے ذریعے نہیں "دعا" کے ذریعے بحال کر دیا گیا تھا۔

اسی طرح صفحہ ۱۹۷ پر مثال دی گئی ہے کہ کس طرح ایک ۳۵ سالہ عورت کے بائیں بازو پر ''زور کلام'' سے جلن سوجن اور پھر چھالا پیدا کر دیا گیا تھا۔ مصنف لکھتا ہے کہ ادب میں جسم انسانی کے اندر مقامی طور پر زخم پیدا ہو جانے کا جو ذکر ملتا ہے اس قسم کی تحقیقات ان کی تصدیق کرتی ہے اور اسی سے کرامت نامہ شاہ دولہؒ صاحب کے مرشد کے ہاتھوں پر پڑنے والے ان چھالوں کو جو آپ کے پتھر توڑنے کی مشقت کی ہمدردی میں پیدا ہو گئے تھے محض خوش عقیدہ لوگوں کی بافت ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ محروم تکلم بچے کو تکلم آشنا کر دینا۔

آگے چل کر کلام کی شفائی اہمیت بیان کرتے ہو مصنف کہتا ہے کہ کلام کی اثر آفرینی اسی وقت ممکن ہے جب معالج کا مریض کے دل میں احترام ہو اور اس کی صلاحیت کا معتقد ہو۔ ادھر جب ہم دیکھتے ہیں کہ احترام اور اعتقاد کی یہ صورت عارفوں کے معاملے میں اہل عقیدت کے اندر از خود موجود ہوتی ہے تو ان کے منہ سے نکلی ہوئی دعا کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں ہو سکتا یہی نہیں بلکہ ان کے مزاروں پر جا کر دعا مانگنے سے بھی نظام عصبی میں وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی میں ان کے حضور آنے والوں میں پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یوں خورد سروں کی تخلیق و تولید کے نفسیاتی اسباب کو خارج از امکان و قیاس قرار نہیں دیا جا سکتا۔

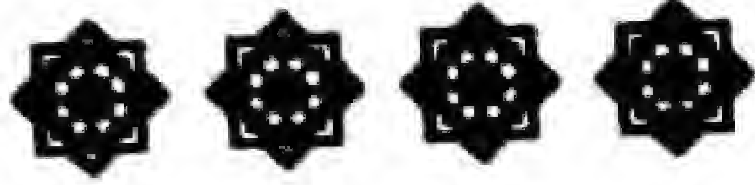
حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں قرون گزشتہ کے غیر مادی رجحان کے خلاف جب سائنس کے نام سے مادی رجحان فکر و نظر کو بالا دستی مل گئی تو ماضی کی ہر اس بات کو نظر انداز کرنا روشن خیالی گنا جانے لگا جس کی بنیاد غیر مادی چلی آرہی ہے اور جس کی نمائندگی روحانی لوگ کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ اس افراط و تفریط میں اعتدال کی راہ اختیار کی جانے لگی اور جیسا کہ

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے روس ایسے غیر مذہبی رجحان رکھنے والے ملک میں بھی اس طرز علاج کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جس کی سائنسی انداز فکر کے غالب آنے سے پہلے اس طریق علاج کو فیض نظر اور اعجاز دعا کہا جاتا ہے اور اب اسے سائیکوتھراپی کا نام دیا جاتا ہے یا سائیکوسمینک طرز علاج کا۔

دونوں میں قدر مشترک مرکزی نظام عصبی کے حوالے سے جسم انسانی کو متاثر کرنا ہے یہ اثر اندازی سائیکوتھراپی میں بھی الفاظ کے ذریعے ممکن ہے اور عارفوں کی دعا سے یا ان کے مزاروں پر جا کر دعا مانگنے سے بھی اتنا تو مسلمہ ہے کہ بعض لوگوں کے مرکزی نظام عصبی کے کیمیائی عمل میں گڑ بڑ سے بعض ضمنی اجزاء پیدا ہو کر روایت شکنی کا باعث بن جاتے ہیں۔ممکن ہے اس گڑ بڑ کا باعث تولیدی اجزاء کے تناسب میں زیادتی ہوتا ہو جو مرکزی نظام عصبی کو لپیٹ میں لے کر مولود کو عقل و شعور سے محروم کر جاتا ہو۔

کیونکہ جس طرح پہلے بتایا گیا ہے۔کروموزم کے بائیس جوڑوں میں اکیسویں جوڑے میں اس نقص کے پیدا ہونے سے وہ مرض پیدا ہو جاتا ہے جسے منگولزم کہتے ہیں اور جس کی واضح پہچان ذہنی پس ماندگی اور مرکزی نظام عصبی کی نشوونما میں خلل پذیری ہوتی ہے۔اسی طرح پانچویں جوڑے کے کرومزوم میں سے ایک حصہ کی کمی خوردسری کے روگ کا باعث بن جاتی ہے اور چونکہ ان جوڑوں کو مرکزی نظام عصبی کے دائرہ اثر و اختیار کے اندر ہی تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے خارج از امکان نہیں کہ کل طبی دنیا میں بھی مرکزی نظام عصبی کی وساطت سے اور آرزو کے طفیل (منت ماننا جس کی ایک صورت ہوتی ہے) جنین کو متاثر کو لینا ایک علمی حقیقت بن جائے۔اور شاہ دولہؒ صاحب سے منسوب یہ کرامت محض خوش

عقیدہ لوگوں کی ذہنی بافت نہ رہے۔



# تعلیمات

## حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمتہ

اسلامی تصوف میں جب دیکھا جاتا ہے کہ کسی بزرگ کی تعلیمات کیا ہیں تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ان کی تصانیف کس قدر ہیں اور ان کے ارشاداتِ عالیہ کیا ہیں ۔یہ سب تو اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر اس فقیر کے خیال میں ایک اور جہت بھی قابل غور اور قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ اولیائے کرام نے ان سب باتوں سے بلند ترین وصف جو پایا تھا وہ ترتیت مریدین۔

اس سلسلہ میں ہمیں اکثر اولیائے کرام کی سیر تھائے مقدسہ کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آستانے نے درحقیقت آج کے دور کی اعلیٰ سے اعلیٰ یونیورسٹیوں سے بھی اعلیٰ تھے ۔اب آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر کیوں تو عرض ہے کہ وہ دراصل سالکین کی عملی تربیت ہوا کرتی تھی۔

اس ضمن میں ہمیں سب سے پہلے تو سرکار غورث پاک رضی اللہ عنہ کا دور اقدس یاد آتا ہے پھر ہمیں ملتان میں حضرت غوث بہاؤ الدین ذکریا ملتانیؒ اور پاکتن شریف میں شیخ الکبیر خواجہ مسعود الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے ادوار یاد آتے ہیں۔ یہاں سے جو لوگ تربیت حاصل کر کے نکلے وہ درحقیقت عملی تربیت اور اس تربیت سے بہرہ مند ہو چکے تھے جو ان کے شیوخ نے عمل کر کے ان کو عطا فرمائی تھی۔

حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمۃ کے بارے میں بھی ہمیں کتب میں یہی ملتا ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں زیادہ تر عملی طور پر ہی تعلیم عطا فرمائی ۔آپ نے اکثر مذہبی نوعیت کی تعمیرات کروائیں ۔آپ نے ایک وڈیرا جس کا نام ''بھلا'' تھا کہ جب وہ آپ کے پاس اولاد کے حصول کے لیے دعا کروانے آیا تو فرمایا کہ ''کنواں مرمت کروا دو اور فرزند پالو''یعنی آپ کے پیش نظر مفاد عامہ ہی اول و آخر تھا ۔آپ ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے کہ دوسروں کے کام کس طرح آیا جائے ۔

یہی عمل ہمیں آپ کے اس دور میں بھی دکھائی دیتا ہے کہ جب قانون گوؤں کے ہاں ملازم تھے ۔آپ نے اپنی دریا دالی اور فطرتی سخاوت کی وجہ سے تمام اجناس اور غلہ غربا و مساکین میں تقسیم کر دیا تھا جبکہ آپ توشہ خانے کے نگران بنائے گئے تھے ۔اس کی سزا بھی آپ نے بہت ہی سخت بھگتی تھی مگر قطعاً پشیمان نہیں ہوئے تھے یہی عمل آپ کا پوری زندگی جاری رہا۔

اس کا علاوہ عملی ترتیت ہی کے طور پر آپ ہر کس و ناکس کی تعظیم عمدہ طریقہ سے کیا کرتے تھے تا کہ آپ کے پاس بیٹھنے والے بھی یہی طور طریقے اختیار کرلیا۔جب بھی کوئی بندہ آپ سے ملنے کے لیے آتا تو آپ اس کی ظاہری وضع وقطع ،نام ونسب ،امیری وغریبی اور عہدہ سے بالاتر ہو کر کھڑے ہو کر اس سے ملتے اس کو گلے لگاتے اور اس کا حال وغیرہ دریافت کرتے ۔

یہ طریقہ تربیت ہی کا حصہ ہے ۔اگرچہ یہ طریقہ موجودہ زمانہ میں پیران عظام میں کم ہی دکھائی دیتا ہے ۔اب تو حال یہ ہے کہ مریدین سلام کرتے ہیں اور پیر صاحب کی توجہ کسی اور طرف ہوتی ہے۔میرے ایک دوست ہیں جو کہ بہت

بڑی روحانی شخصیت ہیں جناب مفتی محمد اقبال کھرل صاحب آپ حضرت میاں میر صاحب کے دربار عالیہ پر خطیب مقرر ہیں۔

اس فقیر نے جب اس ضمن میں ان سے بات کی کہ مفتی صاحب یہ کیسا دستور چل نکلا ہے کہ عقیدت مند ہاتھ چوم رہے ہیں اور پیر صاحب کا دھیان کسی اور طرف ہے جبکہ ایسا رویہ تو ہمیں اپنے اسلاف میں دکھائی نہیں دیتا تو مفتی صاحب نے بڑے دکھ بھرے لہجہ میں فرمایا۔

''شاہ صاحب !اسلاف کی بات ہی کریں کیونکہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے جو تعلیم حاصل کی تھی اسی پر عمل کرنا تھا۔اب تو پیران عظام اس وقت تک تصوف کی طرف رخ ہی نہیں کرتے جب تک ان کے بزرگ وفات نہیں پا جاتے۔

ہم نے تو ایسے ایسے سجادگان بھی دیکھے ہیں جنہیں پیر صاحب کی پوری زندگی میں ان کی ہم نشینی میں نہیں دیکھا گیا مگر پیر صاحب کی آنکھیں بند ہوتے ہی سجادگی ان کو مل گئی بھلا ان کو روحانی اقدار کا کیا علم ہوگا ،اور ان کو جس چیز کا علم ہو گا انہوں نے اسی کو اختیار کرنا ہے۔''

مفتی محمد اقبال کھرل صاحب کی بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے ہم بھی اکثر ایسے ہی حالات دیکھ رہے ہیں۔اب عملی طریقہ سے جو تربیت دی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ ماہانہ محفل یا ختم شریف کا انعقاد کیا جائے جہاں چار چھ دیگیں بریانی یا حلیم کی پکوائی جائیں۔موجودہ دور میں یہی کسی بھی بڑے یا چھوٹے پیر کا معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔اگر کوئی بہت بڑی روحانی شخصیت ہے اور لوگوں کو بریانی یا حلیم نہیں کھلاتا تو وہ بالکل بھی روحانی شخصیت تسلیم نہیں کیا جائے گا۔اور نہ ہی اس

کی کسی بات پر کان ہی دھرے جائیں گے اور نہ ہی اس کی فی الواقع عزت و تکریم ہی کی جائے گی۔

حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کی ظاہری زندگی عملی تربیت اور اخلاقی تربیت کا عمدہ ترین نمونہ تھی۔آپ نے زیادہ تر اپنے عقیدت مندوں کو عملی طور پر ہی سکھایا۔ایک واقعہ کچھ یوں ہے کہ سید جواد بخاری نے پرگنہ گجرات کی فوجداری سے معزولی کے بعد اپنے دیرینہ ہاتھی کو اس لیے آپ کے پاس چھوڑنا چاہا کہ اب وہ اس کو اتنی دور کس طرح لے کر جائے گا تو وہ آپ کے حاضر ہوا اور عرض گزاری ہوا۔آپ نے فرمایا۔

"یکے دولا ضعفی ولاغر ،دوئم فیل ضعیف ولا غر و دوضعفی ولا غر در یك خانه نمی پنجد باید که امام از رائیکه آور ده است اور ابز بیرد."

ترجمہ:ایک تو دولہ ضعیف ولاغر ہے دوسرے یہ کہ تمہارا ہاتھی بھی ضعیف ولاغر ہے پھر بھلا دولہ نمر کس طرح ایک جگہ رہ سکتے ہیں۔

آپ کے اس ارشاد کے بعد بھی سید صاحب اس ہاتھی کو وہیں کھلا چھوڑ کر چلے گئے فقیر کے خیال کے مطابق ان کے پاس دوسری کوئی رائے بھی نہیں ہو گی۔چند روز بعد آپ کو معلوم ہوا کہ وہ ہاتھی بھوک کے ہاتھوں بلبلا رہے ہے تو آپ نے اس کی دیکھ بھال کے لیے نگران مقرر کر دیا اور پل کے نیچے اس کے لیے جگہ مخصوص کر دی۔اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے عملی طور پر یہ درس اپنے عقیدت مندوں کو دیا کہ ہر جاندار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے۔

ایک اور واقعہ کچھ یوں ہے کہ آپ کے پاس ایک قلندر آیا اور آپ سے

تازہ انگوروں اور دو اشرفیاں مانگیں۔ جب اس کا تقاضا حد سے بڑھ گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''میاں آرام کرو، مجھے مولا دے گا تو میں تمہیں دے دوں گا'' یہ سن کر قلندر مغلظات پر اتر آیا اور متواتر دو تین روز تک گندی زبان بولتا رہا۔ آپ نے اس کو ایک مرتبہ بھی نہیں منع کیا بلکہ اس کو کھانے پینے کی اشیاء بھجواتے رہے۔

تین روز کے بعد کابل سے آپ کا ایک عقیدت مند تاجر آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے آپ کی خدمتِ اقدس میں بہت سی چیزیں بطور نذر پیش کیں۔ ان میں یہ چیزیں بھی تھیں جن کا تقاضا اس قلندر نے کیا تھا۔ آپ نے خود جا کر اس کی مطلوبہ چیزیں اسکو پیش کیں۔ وہ آپ کے رویہ اور اپنی بداخلاقی پر بہت پشیمان ہوا۔ اس نے آپ کے قدموں میں گر کر آپ سے معافی مانگی۔ آپ نے اس کو اٹھا کر گلے لگایا اور یوں گویا ہوئے جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ ہو۔

## سیر السلوک الی ملک الموت

یہ کتاب حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کے ساتھ منسوب ہے۔ جناب پروفیسر شریف کنجاہی صاحب کے مطابق سیر السلوک کے دس ابواب ہیں جن کی ترتیب یہ ہے۔ باب اول: دنیا اور لذات دنیا کی مذمت کے بیان میں۔ باب دوم: اس راہ پر چلنے کے لیے شوق انگیزی۔ اس راہ نوردی کی فضیلت اور ان ذمائم کا ذکر جو رکاوٹ بنتی ہیں۔ اسی طرح ان اوصاف حمیدہ کا تذکرہ جو کمال تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں تیسرا باب: ان حجابات کے بیان میں ہے اور اللہ اور عبد کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے اور کیسے رفع کیا جا سکتا ہے۔ توبہ و انابت اور اسباب دنیوی سے کناہ کشی اور دیگر ناگزیر امور کا تذکرہ ہے۔

چوتھا باب: نفس امارہ کے بارے میں ہے۔ اس کا دائرہ۔ اسکی دنیا۔ اس

کا حال اور محل ۔واردات اور صفات ۔قباحتیں اور ان سے نجات کی راہ۔ پانچواں باب نفس لوامہ کے متعلق ہے ۔اس کے محاسب کیا ہیں قباحتیں کیا ہیں ۔ چھٹے باب نفس ملہمہ کا بیان ہے ۔اسی طرح ساتویں باب میں نفس مطمئنہ ،آٹھویں میں نفس راضیہ اور اس کے محاسن کا بیان ہے ۔نویں باب میں نفس مرضیہ کا ذکر ہے اور دسویں میں نفس کاملہ کا اور آخر میں مرشد اس کے اوصاف و احوال کا بیان ہے ۔ مقدمہ میں بعض اصطلاحات کا ذکر آیا ہے ۔اخلاص جوریا کی ضد ہے ۔تصوف سے آداب شرعیہ سے آگاہی کے ساتھ آگاہی مراد لیا گیا ہے ۔اور قیاس ہے کہ داراشکوہ کے اس نظریاتی اختلاف کے باعث بھی شاید اورنگ زیب کی جانب آپ کا میلان زیادہ ہو گیا ہو ۔اس کے علاوہ ''قیوم'' کی اصطلاح بھی ایک سے زائد بار کتاب میں استعمال کی گئی ہے جو ہر چند کسی کا اجارہ نہیں ہے لیکن اس دور میں زیادہ تر مجددؒ صاحب اور ان کے اخلاف سے تعلق خاطر رکھنے والوں میں زیادہ معروف ومقبول تھی ۔اور شاہ دولہؒ صاحب کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے کی دلیل ہے ۔اسی طرح مرشد ۔مراقبہ۔ مشا ۔شہود ۔تجلی ۔حال ۔عین الیقین ۔حق الیقین ۔کا مفہوم بیان کیا گیا ہے ۔شطح ۔ملکوت عبودیت وغیرہ کا مفہوم واضح کیا گیا ہے اور آخر میں وضاحت کی گئی ہے کہ راہ تصوف پر چلنے سے مراد نفس ناطقہ کو زینہ بزینہ اس مقام حقیقی تک لے جانا ہے ۔

ان معالجات اور ادویات کے ذریعے اکمل الاکاملین نے حیال ۔قیام ۔قلت طعام ۔شفقت علی الانام اور ذکر وفکر واکل حلال وترک وحرام وغیرہ کی شکل میں جن کو تجویز کیا ہوا ہے ۔مقدمہ کا آخری حصہ بھی شاہ دولہؒ صاحب کو شریعت دوست عارفوں کی صف میں لے جاتا ہے ۔اگرچہ یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ سیر

السلوک میں بیان کردہ معارف کا انہوں نے عمر بھر ساتھ دیا یا اس سے زندگی کے کسی دور میں ان کا اختلاف بھی تھا یا پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کتاب سالِ تصنیف کے بارے میں خاموش ہے۔

تصوف کے بارے میں آپ نے ایک جگہ اشارہ کیا ہے کہ یہ محض صوف اور مرقعہ ہی کا نام نہیں ہے۔ اسی طرح جب جاہ اور ریاست کو مذموم اور راہ حق سے ہٹا دینے والی چیزیں کہا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مقصد خلقت کی راہنمائی ہو اور بھلائی تو پھر یہ محمود ہے۔ تفاخر مال کا ہو آباء و اجداد کا ہو یا عبادات کا سب کو آپ نے مذموم کہا ہے۔ وحدت الوجود کے بارے میں آپ کا کہنا ہے کہ اس کے عرفان سے آدمی موحد نہیں بن جاتا اور نہ واصل بالحق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ معرفت صاحب معرفت کو بعض اوقات زندقہ کی طرف بھی لے جاتی ہے اور سالک کو سلوک میں شہود وحدت الوجود ہی مفید رہ سکتا ہے۔

یہ تعریف اور توضیح بھی شاہ دولہؒ صاحب کے مجددی مسلک تصوف سے منسلک ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور دارالشکوہ کے آپ سے کٹ جانے کا ایک باعث۔ اورنگ زیب کے نزدیک ہونے کا جواز جس کا ثبوت بختاور خاں کی مراۃ العالم میں شاہ دولہؒ صاحب کے نام کے آجانے سے بھی ملتا ہے کیونکہ اس کتاب میں جن مشائخ وقت کے اسماء آتے ہیں وہ وہی ہیں جن کا ساجدہ علوی کے مطابق عالمگیر سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رہا ہے۔

شاہ دولہؒ صاحب نے مزید وضاحت فرمائی ہے کہ شہود کی یہ حالت و کیفیت مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہوتی ہے لیکن سالک کے لیے اسی وقت مفید رہ سکتی ہے۔ جب اتباع شریعت بھی ساتھ ہو۔ اور مسلک مجددی میں یہی چیز

وجہ امتیاز نفی اور اورنگ زیب کو داراشکوہ پر ترجیح دینے کا باعث کیونکہ جس طرح اوپر اشارہ کیا گیا ہے شاہ دولہ صاحب کا کہنا ہے کہ "وَان لم یکن معھا اتباع الشریعة فھی الذندقة المھلکة" آگے چل کر نفس انسانی کی سات قسموں کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ یہ ساتوں نفوس اصل میں نفس واحدہ ہیں اور صفات کی بنا پر ان کو مختلف نام دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح قلب آپکے نزدیک محض ایک گوشت کا ٹکڑا نہیں ہے۔ یہ ایک لطیفہ زبانی ہے۔ ذکر بالجہر پر آپ نے خاص طور پر زور دیا ہے کیوں کہ جہر و ہر خفی کے بین بین ذکر کرنے کی صورت میں بھی خواطر اور ساوس و افکار کی کثرت کی یورش دم لینے نہیں دیتی اور ذکر بالجہر سے ہی اس کا سد باب ممکن ہے۔

سیر السلوک میں جہاں بہت سے اکابر کا ذکر آیا ہے وہاں شیخ محی الدین ابن عربی کا ذکر بھی ملتا ہے اور قدس سرہ ونور مرقدہ سے دعائیہ لفظوں کے ساتھ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ دولہؒ صاحب مسلک مجددی کی طرف رجحان غالب کے ساتھ ساتھ ابن عربی کے بارے میں وہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ جو بعد میں گروہ بندوں کے باعث عام ہو گیا۔

حضرت مجدد سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات میں عبدالمومن کے مشاہدات کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مقامات قلب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جس مقام پر عبدالمومن پہنچا ہے اس کے بعد اور بھی کئی مقامات ہیں۔ مثال کے طور پر روح۔ سر۔ خفی اور اخفی سیر السلوک میں اسی انداز سے مقامات کا ذکر آیا ہے کہ روح نفس شہوانیہ کا باطن ہے روح کے باطن کا اپنا ایک باطن ہے جسے سر کہا جاتا ہے۔ سیر کا اسی طرح باطن ہے جسے سرالسر کہتے ہیں۔ سرالسر کے باطن کا

نام خفی ہے امر خفی کے باطن کا نام اخفی بتایا ہے جو ایک بار پھر مصنف کو حضرت مجدد کی فکری اور وارداتی حوالہ سے قریب لے جاتا ہے اور اب قاری کو تعجب نہیں ہوتا کہ کیوں اپنی ہمشیرہ جہاں آرا کو شاہ دولہؒ صاحب کے حضور نیاز گزارنے کا مشورہ دینے اور خود بھی حاضر ہونے کے بعد داراشکوہ نے عارفوں کے بارے میں لکھے گئے تذکروں میں شاہ دولہؒ صاحب کو خارج رکھا۔

علم و عرفان کی رقابت جسے اقبالؒ نے منبر کی غلط بینی کہا ہے اور جس سے مسلمان کی شرعی اور عرفانی تاریخ کے اوراق خون آلود ہیں آیات قرآنی کی اپنی اپنی تعبیر و تفسیر کے باعث بھی شدت اختیار کر گئی تھی کیونکہ موخر الذکر مسلک کے لوگ اکثر روش معروف سے ہٹ کر ان کے معانی پیش کرتے تھے۔سیر السلوک میں بھی ہمیں بعض جگہ اس ک جھلک ملتی ہے۔قرآن کریم کی آیت ہے۔"اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ." (45:25) اس کا مفہوم یہی ہے کہ (تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح سایے کو لمبا کرتا ہے یا کس طرح اس نے سایے کو دراز کیا ) لیکن مصنف نے یہ مفہوم پیش کیا ہے کہ کس طرح ظل یعنی وجود اضافی کو ممکنات پر پھیلا دیا ہوا ہے۔

اس وجود اضافی کو نفس رحمانی کا نام دیا گیا ہے۔اسی طرح سورہ کہف کی آیت ہے۔"قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ ۔(18:109)" اس کا معروف ترجمہ یہی ہے کہ "(کہہ دے کہ سمندر اگر مداد یعنی روشنائی بن جائے۔میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے تو بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا۔) لیکن عرفانی ارباب تعبیر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیر السلوک میں کلمات سے مراد

اعیان الموجودات لیا گیا ہے۔اوراس وضاحت کے ساتھ کہ جس طرح کلمات معانی پر دلالت کرتے ہیں۔

اسی طرح اعیانِ موجودات اپنے موجد کے ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔اور جس طرح معانی کوکلمات کے بغیر پایا نہیں جا سکتا اسی طرح موجد کو اعیان موجودات کے بغیر جانا نہیں جا سکتا اور نہ اس کے اسماء کواور صفات کو۔لیکن جس طرح کلمات سے معانی وہی اخذ کرسکتا ہے جوکلمات سے آگاہی رکھتا ہو اور اس کو پڑھ سکتا ہو اسی طرح اعیان سے ذات حق کا عرفان اسی کا مقدر ہو سکتا ہے جو اعیان کا حقیقی فہم رکھتا ہو۔

اس کتاب کے خلاصہ کے حوالہ سے جناب کنجاہی صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔

## باب اول:

# دنیا اور لذات دنیا

دنیا سے یہاں دنیا طلبی مراد ہے وہاں آیات قرآنی سے بھی اپنی بات کو محکم بنایا گیا کہ اچھائیوں سے روک دے۔

چنانچہ جہاں متعدد احادیث نبوی کو سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور وہ بھی ایسی کہ آپ کو "زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْحَرْثِ۔" (14 :3) (لوگوں کے اندران چیزوں کے لیے بڑی کشش ہے۔عورتوں۔بیٹے۔سونے چاندی کے زیورات۔اعلی قسم کے گھوڑے۔پالتو جانور اور کھیتی باڑی کی زمینیں )لیکن ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی ہے کہ فی نفسہ ان

چیزوں میں سے کوئی مذموم نہیں ہے۔

ذم کا پہلو یہ ہے کہ ان کی طلب راہ سے بھٹکا دیتی ہے اور اگر کوئی ان کے بہکاوے میں نہ آئے تو یہ آخرت کے لیے معین و مددگار بھی بنتی ہیں۔ایک حدیث کے ذریعے اسبات کو مزید تقویت دی ہے کہ "مال بذات خود نہ خیر ہے نہ شر کہ شر تو انسان کے اپنے اندر ہے۔اگر اس مال کو راہ خیر میں صرف کیا تو یہ خیر ہو گیا۔اور شر میں خرچ کیا تو شر ٹھہرا۔" آگے چل کر کہا کہ "غنی وہ نہیں جس کے پاس حطام دنیا کی کثرت ہے بلکہ غنی وہ ہے جو اس پر قانع ہے جتنا خدا نے اسے دیا ہے۔"

## باب دوم

# طلب کمال

یہ مسلک اپنانے کا شوق پیدا کرنے اور اس کی فضیلت کے بیان میں طلب کمال کو اشرف الخصال کہا گیا ہے اور کمال سے مراد اوصاف ذمیمہ سے کنارہ کشی اور اوصاف حمیدہ کی خوگری لی گئی ہے۔اوصاف ذمیمہ میں جہل۔غضب۔حقد۔حسد بخل تعاظم۔تکبر عجب وغرو۔ریا۔حب جاہ وریاست۔کثرت کلام۔مزاح۔تزئین ۔تفاخر وغیر کا نام لیا گیا ہے۔جب کہ اوصاف حمیدہ میں علم۔حلم صفاء۔باطن۔کرم۔تواضع۔صبر شکر۔زہد۔توکل۔حیا۔رضا وغیرہ کو شمار کیا گیا ہے اور پھر ان سب منفی اور مثبت اوصاف کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

مال و منال دنیا کی طرح یہاں بھی آپ نے جاہ ریاست کے سلسلہ میں یہی کہا ہے کہ اگر ان کے حصول کا مقصد اپنے نفس کو موٹا کرنا ہے تو یہ مذموم

ہے لیکن اگر ارشاد الخلق مقصود ہے تو یہ محمود ہے۔ چنانچہ مرشد کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ہی ہوتا ہے جسے اللہ نے اس کام پر لگایا ہو کہ لوگوں کو حق کی دعوت دے اور اس پر واجب ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام ایسا نہ کرے جس سے وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے۔

اس فعل کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے۔ یہاں ایک حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ حضورؐ جب صحابہؓ میں بیٹھنے کے لیے گھر سے نکلتے تو آئینہ دیکھ لیتے۔ عمامہ درست کر لیتے اور بال سنوار لیا کرتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا تو کہا کہ اللہ اس کو پسند کرتا ہے جو اخوان میں جانے لگے تو اپنے آپ کو آراستہ کر لے۔ لباس اور آرائش کے بارے میں مصنف کا یہ نکتہ نگاہ عام صوفیاء کے اس بارے میں ارشادات سے خاصا مختلف ہے لیکن بے دلیل وزن نہیں ہے۔

## باب سوم

عبد اور معبود کے مابین حجابات کے بارے میں اور کس طرح سالک ان پردوں کو اٹھا سکتا ہے اس سلسلہ میں توبہ و انابت کا نام لیا گیا ہے اور اسباب دینوی سے تجرد یعنی کنارہ کشی وغیرہ کا۔ ذنوب یعنی گناہوں کو اعظم الحجب یعنی تمام حجابات سے بڑا حجاب کہا گیا ہے۔ ان کا مزاج ظلماتی ہے۔ ذنوب سے پیدا ہو جانیوالے حجاب کی صورت جدار کی سی ہے جو طالب اور مطلوب کے درمیان میں حائل ہو تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے مقابلہ میں حجاب نورانی کی حیثیت زجاج کی سی ہوتی جس میں سے ماوراد یکھا جا سکتا ہے۔

حجاب ذنوبی کو دور کرنے کے لیے ندامت بہت ضروری ہے۔اسی طرح سماع موعظت اور نفع بخش علوم کا حاصل کرنا۔بعض عبادات کے ذریعے توجہ الی اللہ کرنا اور گناہوں کے ضرر کی معرفت بھی اس ضمن میں ممد ہوتی ہے۔یہی صورت ذکر حق کی اور تہلیل کی ہے جس سے قلب میں شمع روشن ہو جاتی ہے جو ظلمت اور تاریکی کو دُور کر دیتی ہے۔ایک توبہ عوام کی ہوتی ہے جس سے مراد کیے گئے گناہوں پر ندامت ہے۔اسی طرح خواص کی توبہ وہ ہوتی ہے جو حضور مع اللہ سے غفلت اور ذھول کا نام ہے۔یہی صدیقین کی توبہ ہے۔

## باب چہارم

# نفس امارہ

اس سے پہلے جس طرح بتایا جا چکا ہے ساتوں قسم کے نفس اصل میں ایک ہی نفس ہے اور صفات کی اعتبار سے ان کو الگ الگ نام دیئے گئے ہیں۔یہ نفس نفس ناطقہ ہے جس سے قلب مراد ہے اور ارشاد ربانی میں جہاں "لِمن کانَ لَہٗ قلبٌ" (37:5) (یعنی جس کے پاس قلب ہے) آیا ہے تو اس سے مراد گوشت کا وہ ٹکڑا نہیں ہے (جو جسم میں دھڑکتا ہے) یہ تو لطیفہ ربانی ہے۔

طبیعت یعنی مادی دنیا کی طرف میلان اور شہوات کی جانب جھکاؤ سے جس کا ناس (نست) ہو جاتا ہے۔اور وہ روح حیوانی کا روپ بدل کر حیوانوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔اس کی اوصاف حمیدہ اوصاف ذمیمہ سے بدل جاتا ہے اور صورت شکل کی سوا دونوں میں کوئی وجہ امتیاز نہیں رہتی۔نفس کی اسی صورت کے بارے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا کہ "ان النّفسَ لا مارۃٌ بِا

لسوء" (53:12) اس کے خلاف جہاد کو اسی بنا پر جہاد اکبر رسول کریم نے قرار دیا اور جہاد بالکفار کو جہاد اصغر۔

اسی کے ذریعے شیطان کو انسان کے اندر عمل دخل ہونے لگتا ہے۔اور اسے کھانے پینے اور سونے میں کمی کرنے سے ہی ٹالا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں نفس شہوانیہ کو کمزور کرنیوالی ہیں اور اس کے کمزور پڑنے سے ہی نفس علویہ کو رہائی مل سکتی ہے۔تہلیل اس مقام پر مفید رہتی ہے لیکن یوں کہ 'لا' کو کھینچ کر ادا کیا جائے 'اِلہٰ' کے ہمزہ یعنی 'الف' کو تخفیف کے ساتھ اور اس 'ہ' کو خفیف سی 'زبر' کے ساتھ اور آخری حرف کو سکون کے ساتھ نیز 'ھا' اور 'الا اللہ' کے درمیان کوئی فصل نہ ہو۔اور یوں بھی نہ ہو کہ 'لا اِلہٰ' کی جگہ 'لا اِیلا ادا ہو کہ اس طرح ذکر کرنیوالے کو کچھ حاصل نہیں ہوگا نیز ذکر بالکثرت اور بالجہر ہونا چاہئے اور شب و روز ہونا چاہئے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔" آپ نے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب پر زور دیا ہے۔نفس کو قید طبعی سے نجات دلانے اور آئینہ قلب کو صیقل کرنیکی تاکید کی ہے تاکہ وہ مطالعہ غیوب کے قابل ہو سکے۔ادراک حقائق اشیاء اور فہم دقائق علوم کے قابل ہو جائے۔اوصاف منفی اس راہ میں بڑی رکاوٹ بتائے گئے ہیں۔

ذکر کثیر کے ساتھ آپ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ ابواب شرعیہ سے آگاہی ہو۔ہر ساعت محاسبہ نفس ہو۔اسے موت۔عذاب قبر اور جہنم کے احوال سے خوف دلایا جائے۔اس مقام پر پہنچ کر خوف کے ساتھ رجا کی حالت کی پیدا ہونا بھی ضوری ہے جس کے لیے خضوع و تضرع کے ساتھ اسباب رجا اور اللہ تعالٰی کی رحمت کی وسعت کا ذکر بھی ضروری ہے اور اس کا لطف و احسان طلب کرنا

چاہئے اور دعا و التجا کے ذریعے کیفیت خوف سے نجات کا طالب ہونا چاہئے اور اس کے عفو و درگذر کو سامنے رکھنا چاہئے۔

دعا کو رسول کریمؐ نے عبادت کہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں نوید دی ہے کہ ''اُدۡعُوۡنِی اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ۔'' (60:4) (تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا) ایک اور حدیث میں دعا کو ''سلاح المومن'' ''عمادالدین'' اور نور السموات والارض بتایا گیا ہے۔ یوں نفس کو آفات سے نجات دلانے میں مشغول ہونے کے بعد انسان بعض عجائب مکنونہ اور اسرار مخزونہ کو صدف بشریہ میں دیکھنے لگتا ہے۔

دواءُ کَ مِنکَ وَمَا تبصرُ — وداءُ کَ مِنکَ وَمَا تَشعُرُ

وَتَزعَمُ اِنّکَ جرمٌ صَغِیرٌ — وَفِیکَ الطویٰ العالم الاکبرُ

باب پنجم

# نفس لوامہ

اس کے احوال واردات وصفات اور ان سے رہائی کی سبیل اور اس مقام سے اگلے مقام کی طرف ترقی کیوں کر ممکن ہے۔ یعنی وہ مقام جہاں پہنچ کر نفس ملہمہ ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اس کے ساتھ ہی نفس امارہ کے بعض اوصاف بھی موجود رہتے ہیں لیکن اب اس میں حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی دنیا دنیائے برزخ ہوتی ہے۔

اس کا ٹھکانہ قلب ہوتا ہے اور اس کا حال محبت اس کی واردات طریقت اور صفات لوم، فکر، اور عجب اور خلق سے ریاء خفی سے اور شہرت اور ریاست سے ریز بعض صفات ناپسندیدہ سے خلاصی کی ابھی قدرت نہیں ہوتی۔ اگر چہ مجاہدہ کی

طرف رغبت ہوتی ہے نیز قیام و صیام و صدقہ وغیرہ ایسے اعمال صالحہ کی جانب صفات ناپسندیدہ کا پوری طرح قلع قمع کر لینا انسان کو مخلصین کے مقام پر لے جاتا ہے جس کے بارے میں حدیث نبویؐ ہے کہ تمام انسانوں کا مقدر ہلاکت ہے سوائے عالموں کے اور تمام عالموں کے مقدر ہلاکت ہے سوائے عاملوں کے۔

اسی طرح تمام عاملوں کا یہی مقدر ہے سوائے مخلصوں کے۔اس کے بعد مقربین کا مقام ہے۔ یہ لوگ اپنے نفوس سے فنا کے اور اپنے رب کی جانب بقاکے طالب ہوتے ہیں جسے مرنے سے پہلے مرجانا کہا گیا ہے۔ایک درخت کی مثال یہاں مناسب رہے گی جس پر شاخوں کی کثرت ہے ہر شاخ پر ایک خاص قسم کا زہریلا پھل لگتا ہے۔لوگ آتے ہیں اور شاخوں میں الجھ جاتے ہیں۔لیکن درخت کاٹنے کی طرف نہیں آتے۔اور نہ اس آبیاری کی راہ بند کرتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ شاخیں تو کاٹنے کے بعد دوبارہ پھوٹ پڑتی ہیں۔شجر کی مثال بطن انسانی کی ہے اور شاخیں اس کی صفات ذمیمہ ہیں۔

ابرار جب پا جاتے ہیں کہ یہ صفات مہلکات میں سے ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو کوشش کرتے ہیں کہ ان سے دور دور رہیں۔ مشائخ نے اس سلسلہ میں جو طریق کار بتایا ہے اس میں یہ چھ باتیں ضروری ہیں۔ تقلیل طعام و منام و کلام اور گریز از انام۔ ذکر دوام اور فکر تمام۔ ذکر جہر کو یہاں بھی ضروری قرار دیا ہے اور ایسی آگ بتایا ہے جو تمام وسوسوں اندیشوں کو بھسم کر دیتی ہے۔اسی طرح زلال وصال کے پیاسوں کے لیے ترک خلائق و لذات اسی قدر ضروری ہے جس قدر وہ مجاہدہ جو مشاہدہ (ذات) تک لے جائے۔

یہ طریق جدو جہد کا ہے اور جس نے جدو جہد سے کام لیا کامران ہوا۔مگر

جس نے سستی برتی وہ راہ میں ٹوٹا گیا۔ کیوں کہ بٹ مار ادھر بے شمار ہیں اور سب سے بڑا بٹ مار ہجوم خلق میں رہتا ہے اور اس کی طرف مائل ہونا اور نشست و برخاست رکھنا۔ تصفیہ اور تصفیہ قلب پر آپ نے زور دیا ہے اور اس کے لیے اولاً یہ دعا تجویز فرمائی ہے۔ "یا مصرف القلوب صرف قلبی الی طاعتک" اور آخراً یہ دعا۔ "یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک" اور اسے طلوع صبح سے پہلے اور غروب کے بعد زبان پر لائے۔ یاد رہے کہ تقلیب قلب سے مراد غفلت سے ذکر کی طرف ضحک سے گریہ کی طرف خوف سے امن کی طرف اور قبض سے بسط کی طرف جانا مراد ہے۔

مشاہدہ کے بارے میں ایک بار پھر کہا ہے کہ وہ مجاہدہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس طرح ہی عالم مثال میں داخلہ ممکن ہے جسے مقام قلب بھی کہتے ہیں اور وہ ساتوں مقامات میں سے آخری مقام ہے۔ لیکن یاد رہے کہ سالک کے لیے عالم مثال میں داخل ہونا نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں ممکن ہے۔ ابتداء میں اس کا جھکاؤ نیند کی طرف زیادہ ہوتا ہے لیکن بعد میں وہ بیداری کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں اسے بعض روحانی صورتیں نظر آتی ہیں اور وہ گمان کرتا ہے کہ وہ عالم بیداری میں سب کچھ دیکھ رہا ہے حالانکہ وہ بیداری مائل حالت میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ سالک نے حقیقت میں شیطان کو دیکھا ہوتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس نے رب کو دیکھا ہے۔

قلب میں حکمت کو آپ نے ایسے گھر میں شمع سے مثال دی ہے جس میں پانچ دروازے ہوں۔ اب اگر دروازے بند ہوں گے تو شمع روشن رہے گی اور گھر منور۔ اور اگر دروازے کھل جائیں گے تو شمع بجھ جائے گی اور گھر میں اندھیرا ہو

جائے گا حواس خمسہ ہی پانچ دروازے ہیں۔جن کا بند رہنا ہی ضروری ہے کیونکہ اس سے عالم شہادت کا ادراک تو ہو جاتا ہے لیکن عالم غیب سے تعلق کٹ جاتا ہے اول الذکر حضور حق سے بعد کا نام ہے اور قلب ادھر ہوا تو حیوان ہو گیا اور اسیر شہوات لیکن اگر اس نے عالم غیب کی طرف رجوع کیا تو انسان کامل بن گیا اور امانت کا بار اٹھانے کے قابل اور **خلیفتہ اللہ فی الارض**۔

سالک کے لیے آپ نے چار باتیں عمل کے لیے بتائی ہیں۔(۱)اس کا ایمان ہو کہ قدرت الٰہی سے کوئی چیز سر گرداں نہیں ہو سکتی۔(۲)اللہ تعالیٰ ہر شے کو جاننے والا ہے۔(۳)وہ رؤف ہے ارحم الراحمین ہے (۴)اس کے تمام افعال خیر ہی خیر ہیں۔

## باب ششم

# نفس ملہمہ

اس میں سالک کی سیر اللہ کی جانب اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ اس کے اندر ظہور حقیقت ایمانیہ ہو جائے گا اور ماسوا اللہ کے شہود میں فنا ہو جائے۔یہاں سالک کا عالم ارواح ہوتا ہے اور محل روح ہوتا ہے۔حال عشق اور واردہ معرفت۔صفات۔سخاوت۔وقناعت۔علم وتواضع وصبر وتحلم وتحمل۔عفواور قبول عذر وغیرہ۔اس مام کو ملہمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام (اشارہ غیب) مجور وتقویٰ نہیں کر سکتا اور نہ القاء ملکی اور القاء شیطانی کے درمیان کیوں کہ طبیعت یعنی مادہ سے پوری طرح خلاصی نہیں پا سکا ہوتا۔اور مقتضیات بشری ابھی اس میں موجود ہوتی ہیں اس لیے خدشہ ہوتا ہے کہ ذرا غافل ہو اور اسفل

السافلین کی جانب پھیل گیا۔

نار طبیعت اس صورت میں اس کے قلب میں سے ایمان کو پھونک ڈالتی ہے وہ خیالات شیطانیہ کو تجلیات رحمانیہ سمجھنے لگتا ہے۔اسی لیے متابعت شیخ یہاں بہت ضروری ہوتی ہے۔اس وادی کے معاملات اور واردات پر تفصیل سے اظہار خیال کرنے کے بعد آپ خلع عذار کی تشریح کرتے ہیں کہ جو لوگ اس سے ترک اورامر شرعی مراد لیتے ہیں وہ گمراہ ہیں اور ملحد ہیں۔کیونکہ خلع عذار سے مراد امور نفسانیہ سے کناہ کشی ہے۔اور اہواء شیطانیہ سے یہ ان موانع کو ختم کرتا ہے جو لقاء محبوب کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور وہ بے شمار ہیں۔عارف کے لیے یہ خلع عذار دشوار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ مقام عشق میں پہنچا ہوتا ہے یہاں ایک بار پھر آپ نے چشم بند ولب بے بند و گاش بند پر زور دیا ہے۔

مقام روح کو آپ نے محل عشق ٹھہرایا ہے اور بتایا ہے کہ سالک کا اس میں قیام طویل ہوتا ہے۔کیوں کہ عاش اپنی ذات کو نظر انداز کر کے محبوب میں مشغول ہوتا ہے اس کا نام لیتا ہے۔اس کے حسن کی تعریف سے متعلق اشعار ترنم سے ادا کرتا ہے۔یہ حالت بط ہوتی ہے جس کے بعد حالت قبض بھی آجاتی ہے۔وہ خواب عشق سے بیدار ہوتا ہے تو تکلیف محسوس کرتا ہے۔

اس سے آگے ایک اور مقام آتا ہے جس میں بسط وقبض ہیبت وانس میں بدل جاتے ہیں۔فرق یہ ہے کہ قبض میں نفس تنگی محسوس کرتا ہے جو ہیبت میں نہیں ہوتی۔اسی طرح بسط کے عالم میں ادب مع الحق کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ حالت انس میں نیں ہوتی۔غرض خوف و رجاء قبض و بسط ہیبت و انس جو اشخاص اور مقامات کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہیں۔نفس امارہ اور لوامہ میں ان کو خوف ورجاء

کہتے ہیں ۔نفس ملہمہ میں قبض و بسط جبکہ نفس مطمئنہ یا راضیہ و مرضیہ میں ہیبت و انس اور نفس کاملہ کی صورت میں جلال و جمال ۔خوف و رجاء مبتدی کے لیے ۔قبض و بسط متواسط کے لیے ۔ہیبت و انس کامل کے لیے اور جلال و جمال خلیفہ کے لیے اور بھولنا نہیں چاہئے کہ ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا۔

سالک کو سلوک میں بلند تر لے جانے والی چیز یہ ہے کہ اس کے اوصاف ذمیمہ (جو مقتضیات بشری ہیں )اوصاف حمیدہ سے بدل جائیں جو اس کو مالک سے نجات دلانے کا باعث بنیں گے ۔کیونکہ اس سلوک کا مقصد وصول الیٰ الملک الملوک ہے جو رفع حجابات کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔حجابات اصل میں طلب و مطلوب کے مابین عدم مناسبت کا دوسرا نام تبدیلی صفات سے مناسبت کے قریب پہنچا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر کھانے کی جگہ بھوک ،سونے کی جگہ بے داری اور تکبر کی جگہ افتقار اختیار کرنے سے ۔لیکن اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ پیٹ بھرنا جہاں حیوانیت ہے وہاں نہ کھانا فرشتوں سے مخصوص ہے اور انسان کو بین بین روش اختیار کرنی چاہے ۔تیز یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ عبودت کا آخری درجہ رسول کریمؐ کے لیے مخصوص ہے اور وہاں تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا اور سالکان راہ طلب کی باقی مقامات کے لیے سعی کرنی چاہیے۔

عالم مثال کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے یہاں اس کو نیز عالم بروزخ کو عالم ملکوت کی شاخیں بتایا ہے اور کہا ہے کہ سالک جب عالم مثال میں داخل ہوتا ہے تو اپنی استعداد کے مطابق مشاہدہ کرتا ہے اور اس پر واجب ہے کہ اگر ان احوال کا وصال اس کا مقدر نہیں ہوا تو ایک عاشق کی طرح اس طلب میں لگا رہے اور جو

طلب میں لگا رہتا ہے وہ پا بھی لیتا ہے۔ہاں اذکار و اوراد کے ذریعے اللہ تعالی سے استعانت طلب کرتا ہے اور خاصیت اسمائے سے منکر نہ ہو۔

اسماء کے یہ خواص ذکر کثیر کے بغیر ظاہر نہیں ہوتے اور اس میں غفلت اور کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور تمام آداب و اجب کے ساتھ جن میں تمسک بالشریعت بھی لازمی چیز ہے۔بعض اوقات اس وظیفہ کا ذکر کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔"لَآ اِلٰـهَ اِلَّاھُو لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُو." 'لا' کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے اور 'ھو' کی واو کو۔ یہ ذکر یوں ہونا چاہئے کہ اعضاء جسمانی کہتے نظر آئیں کہ وجود میں ہویت حق کے سوا کوئی نہیں ہے۔یہ بھی یاد رہے کہ ماسوا اللہ تعالی کے صفات وافعال ہی ہیں اور یہ کاملین کا مشہد ہے۔اس شہود کا نفس کو خوگر کرنے سے اور اس میں مداومت سے سالک پر وہ حال طاری ہو جاتا ہے جس سے وہ ٹوٹ نہیں سکتا اور یہی غایت القصوی' ہے۔اور اس مقام پر پہنچنے والے کے لیے خلق حق تعالی سے حجاب کا باعث نہیں بن سکتی اور نہ حق خلق سے اسی طرح نہ کثرت وحدت سے حجاب بنتی ہے اور نہ وحدت کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور مظاہر میں مشاہدہ حق کرتا ہے وہ ظاہر کو بلا مظاہر مشاہدہ نہیں کرتا اور جو موحدین کے لیے مشہد کا درجہ رکھتے ہیں اور نہ مظاہر کو بغیر ظاہر کے جو محجوبین کے لیے مشہد ہیں اور یہ مشہد تین ہیں کامل ناقص اور انقص موحدین کا مشہد ناقص ہے کہ انہوں نے ظاہر اور مظہر کو ایک کر دیا ہے۔محجوبین کا مشہد انقص ہے کہ انہوں نے صرف خلقت کا مشاہدہ کیا ہے۔اور کثرت میں وحدت کا کاملین کے مشہد کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

باب نہم

# نفس مرضیہ

کے بیان میں اس کی سیرات و عوالم محلات و احوال و واردات وصفات و کیفیات ان میں اور ان کے توابع مقامات میں کیوں کر داخل ہو جا سکتا ہے۔ سران کی عن اللہ ہوتی ہے۔عوالم عالم شہادت محل خفا ہے اور حال حیرت واردہ شریعت اور صفات حسن خلق اور ترک ماسوی ۔اس طرح ظلمات طبعی و نفسی سے انوار اور ارواح کی جانب میلان پیدا ہو جاتا ہے نفس مرضیہ کی صفات میں خلق اور خالق کی محبت یک جا ہوتی ہے اور وہ ایک کا مقدر نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر پہنچ کر سالک خلق کو اس کی ظاہری حالت کے اعتبار سے دیکھنے کی جگہ اسے معنوی اعتبار سے جاننے لگتا ہے۔لیکن بعض لوگ شیخ محی الدین ابن عربی اور دیگر اکابر صوفیہ کی تحریروں کے مافیہ کو نہ سمجھتے ہوئے اس مقام پر احاد کی راہ کو نکل گئے اور شریعت سے کنارہ کش ہو گئے ۔کیوں کہ معنوی زندگی کی بعض کیفیات اور بعض امور ایسے ہیں کہ ان کا ادراک عقلی ممکن نہیں ہے بجز تائید الٰہی کے مثلاً فنا سے معنوی زندگی میں کیا مراد ہے۔

اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ خارج میں اس کی نظیر نہیں ہے۔اور بقا کی بھی یہی صورت ہے لیکن یاد رہنا چاہئے کہ سالک کے آخری مقامات میں سے یہ ہے کہ وہ صورت آدمیہ تک پہنچ جائے جس کے باعث انسان سجود ملائک بنا۔اور جس کی حقیقت حقیقت محمدیہ ہے یہی سر اعظم ہے اور لطیفہ الٰہی حضرت رب میں یہی غایت قرب بھی ہے جس میں اوصاف ربوبیت کے عرفان کے ذریعے عرفان نفس عرفان خداوندی کے قابل ہو جاتا ہے۔ برائت عبودیت مرئات ربوبیت کے مقابل آجاتی ہے۔اور یوں پرتو افگنی ہو جاتی ہے۔

تمام تر کی تمام تر میں اور یہ جو کہتے ہیں کہ ارض و سماء میں جو کچھ ہے

قلب مومن میں سما جاتا ہے۔اس سے مراد یہی ہے کہ لیکن یاد رہے کہ جس نے بھی رب کو پہچانا علم الٰہی کے ذریعہ ہی پہچانا یعنی اس سر کے ذریعے جو حقایق الاشیاء میں ودیعت ہے ''عَلَّمَ آدَمَ الاَ سُماء'' (31:2) سے یہی مراد ہے یہ سالکین کے اعظم مطالب میں سے اور سائرین کی منازل اعلی میں سے ہے اس عالم وجود کاملین کے نزدیک سب سے اعز یہی ہے کہ اس کی طلب میں لگا رہے استقامت کے ساتھ طریقت کی راہ پر چلتے ہوئے شریعت کا دامن تھامے ہوئے اور ''القیوم'' کی تلاوت کرتے رہتے ہوئے۔

باب دہم:

# صفات مرشد

صفات مرشد کے بیان میں اس بات میں بھی قابل ذکر بات یہ ہے کہ مصدر ارشاد ہونے کے لیے ضروری بتایا گیا ہے کہ مرشد فقہ اور عقائد اہل سنت و الجماعت کے معاملہ میں مریدوں کی تشنگی کا مداوا کر سکتا ہے۔اسی طرح اپنے کمالات قلبی کو جانتا ہو۔آفات نفسانی اس کے امراض اور علاج اور حفظ صحت (معنوی) سے بھی آگاہ ہو لوگوں کے ساتھ رافت اور رحم کا رویہ رکھتا ہو۔

خصوصاً اپنے مریدوں کے ساتھ اور جس مرید کو سلوک کے قابل سمجھے اسے اس راہ پر بہتر طریقے سے لگائے۔ترک اسباب میں اس کی مدد کرے۔مالی امداد بھی (جب اور جس قدر ضروری سمجھے) کرے۔لیکن جو مرید اس قابل نہ ہو اسے کاروبار معاش میں لگے رہنے کی ہدایت کرے۔مرید قابل کی علامات یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ قلب حزیں رکھتا ہو اور منکسر الرس ہو کیوں کہ ایک حدیث کے مطابق اللہ قلب حزیں کو

پسند کرتا ہے۔حالت فرح کو مذموم جانتا ہو۔اللہ تعالیٰ سے ہر وقت تزکیہ نفس کا طالب ہو کہ نفس ہی سالک کا عدو ہے' مرشد کی خوبی یہ ہے کہ مرید جو کچھ اس پر ظاہر کرے اسے مستور ہی رہنے دے اور خود خوراک و پوشاک کے معاملہ میں کسی امتیاز کو روا رکھنے والا نہ ہو۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ شیطان سالکین کی جانب کئی دروازوں سے داخل ہو سکتا ہے اور نفس کی ہر منزل میں اس منزل کی مناسبت سے دروازے موجود ہوتے ہیں۔شیطان ان میں سے در آتے ہوئے سالک کے اندر عجب و غرور پیدا کر دیتا ہے۔عظمت نفس میں مبتلا کر دیتا ہے۔انسانوں کو حقارت سے دیکھنے کی طرف لے جاتا ہے اور یوں ان حجابات ظلمانیہ کی زد میں کر جاتا ہے جو طبعی ہوتے ہیں۔چنانچہ ان پردوں کے پڑنے سے سالک نواہی سے بچنے کی جگہ ان کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔

زنا، شراب اور حرام خوری میں ملوث ہو جاتا ہے۔یہاں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ترک شریعت زندقہ ہے چنانچہ استقامت علی الطریقت کی تلقین کی گئی ہے جس سے ستر شریعت منکشف ہوتا ہے۔جو ظاہر شریعت ہی میں مخزون ہے اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" کہہ دو کہ اگر تم اللہ کی حب رکھتے ہو تو مجھ سے محبت رکھو اس طرح اللہ تم سے محبت رکھے گا۔" تو وقوف علی الشریعت کے لیے یہی آیت کافی ہے۔

فقیر ان کتابوں کی زیارت سے محروم ہے چنانچہ محترم المقام جناب پروفیسر شریف کنجاہی صاحب کی مساعی جلیلہ سے قارئین کرام کو بھی مستفیض کرنا اپنے لئے سعادت خیال کرتا ہے۔

# وفات

حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کا سال وصال بھی دیگر اولیائے کرام کی طرح کسی بھی کتاب میں مستند موجود نہیں۔ ہمیں جو بھی دستیاب ہوتا ہے آپ کی خدمت میں عرض کر دیتے ہیں۔ ''خلاصتہ التوارخ'' میں آپ کا وصال سترہ عالمگیری سات جلوس یعنی 1085 ھ میں ہوا تھا۔

جناب چراغ قادری صاحب کے مطابق آپ کا وصال 1086 ھ میں ہوا تھا۔ اور انہوں نے یہ تاریخِ وصال ''محبوب مولا شیخ دولا'' سے نکالی ہے۔

جناب مشتاق رام صاحب نے ''کرامت نامہ'' کے صفحہ نمبر 188 پر لکھا ہے کہ

ولی شاہ دولہ کہ از اوست بود
بذکرش شب و روز ہم اوست بود
خرد خواست چوں از وصالش ضمر
سروشش بگفتا خدا دوست بود

اس میں ''خدا دوست بود'' سے آپ کا سالِ وصال 1087 ھ نکلتا ہے۔

آخری وقت میں آپ نے اپنے خلیفہء خاص حضرت پیر بھاون شاہ صاحب کو طلب کیا اور حسب دستوران کو دلق عطا فرمائی۔ آپ نے ان کو اپنی حیاتِ مبارکہ میں ہی سجادہ نشین اور جانشین مقرر فرما دیا تھا۔

بعض کتب میں یہ تحریر ہے کہ بھاون شاہ صاحب آپ کے چیلے تھے، بعض

کہتے ہیں کہ وہ آپ کے لے پالک تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ آپ کے صاحبزادے تھے۔ تمام باتوں کا درست تو اللہ کریم علیم وخبیر کے پاس ہے۔ موجودہ سجادگان پیر بھاون شاہ صاحب ہی کی اولاد پاک ہیں۔

اس بات میں بحر مال کوئی شک وشبہ نہیں کہ پیر بھاون شاہ صاحب آپ کے حد درجہ عقیدت مند اور خدمت گذار تھے آپ نے پوری زندگی اپنے پیرومرشد کی خدمت گذاری میں ہی گذار دی۔ یعنی آپ فنافی الشیخ تھے۔

آپ کا مزار اقدس اس وقت گجرات کے مصروف ترین علاقہ میں واقع ہے۔ مگر آپ کا مزار شریف جب بنایا گیا تھا اس وقت وہاں کی آبادی برائے نام ہی رہی ہوئی۔ ''اے گلوسری آف ٹرائیس آف کاسٹس آف دی پنجاب اینڈ این ڈبلیو ایف پی''۔

A Glossary of Tribes of castes of the Punjab and N.W.F.P

کے والیم اول کے صفحہ نمبر 630 پر درج ہے کہ۔

''شاہ دولہ صاحب کا مزار اور دربار گجرات شہر کے مشرقی جانب دروازہ شاہ دولہؒ سے سوگز کے فاصلہ پر واقع ہے ان کے اخلاف دربار کے قریب میں اور آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جن کے مکانات مل جل کر ایک اچھا خاصا محلّہ بن چکے ہیں۔ جسے گڑھی شاہ دولہ کہتے ہیں۔

دربار شریف سترھویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آپ کے سجادہ نشین اول حضرت پیر بھاون شاہ صاحب کی مساعی جلیلہ سے 1867ء میں اس کی کرسی اونچی کر کے

اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جبکہ 1898ء میں شاہ دولہ صاحب کے عقیدت مندوں نے مکمل طور پر اس کی تعمیر دوبارہ کی تھی۔

شاہ دولہ کا مسلک کسی غیر معمولی خط و خال کا حامل نہیں ہے۔ دربار سے وابستہ کوئی اراضی نہیں ہے۔ ان کے پیروں کا تمام تر گذارا وہاں آنے والے خوش عقیدہ لوگوں کی نذر و نیاز پر ہے۔

سال میں تین بار میلہ لگتا ہے۔ ایک ایک عیدوں پر اور ایک عرس جو کہ محرم کی دس تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ جمعہ کو ہفت روزہ میلہ بھی لگا کرتا تھا۔ جس میں رقاصائیں آیا کرتی تھیں۔ لیکن اسکا اب رواج نہیں رہا۔

سجادہ نشینی کے لئے کوئی بھی باقاعدہ اصول قائم نہیں کیا گیا ہے (اورل پیر بھاون شاہ صاحب) ولی کے خاندان کا ہر فرد ہی اس میں حصہ دار ہے۔"

# کرامات

## حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ

یوں تو حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کی بے شمار کرامات عوام وخواص میں زبان زدِ عام ہیں۔ مگر ہم آپ کی خدمتِ اقدس محض چند ہی پیش کریں گے۔ ایک کرامت آپ کی کچھ یوں جناب چراغ قادری صاحب اور مشتاق رام صاحب نے کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ ابھی شاہ سیدا کے حضور پیش نہیں ہوئے تھے کہ ان سے پہلے شاہ سیدا کے حضور منگو نام کا ایک خادم ان کی خدمت گذاری کیا کرتا تھا۔ آپ جب شیخ کی خدمت میں پیش ہوئے تو آپ نے یہ محسوس کیا کہ اس بندے کی مرضی ومنشا کے بغیر یہاں جگہ بنانا، آسان نہیں ہوگا۔ آپ نے اس کا بھی دل جیتنے کی کوشش کی اور شیخ کی خدمت گذاری میں مصروفِ عمل ہو گئے۔ منگو نے آپ کی ذمہ داری یہ لگائی کہ آپ سیالکوٹ جاکر بھیک مانگتے اور کاسہ میں روٹیاں وغیرہ رکھ کر شیخ کے حضور پیش کر دیئے۔ شیخ بقدر کھا کر باقی منگو کو دے دیئے۔ منگو خود کھا کر باقی جو بچتا وہ آپ کو دے دیتا خواہ اس سے آپ کا پیٹ بھرتا یا نہ بھرتا۔

حضرت شاہ سیدا علیہ الرحمتہ کی نظروں سے یہ سب کچھ کہاں پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ ایک روز آپ کو شیخ نے فرمایا کہ ''یہ مانگے کے ٹکڑے اور لوگوں کے چبائے ہوئے نوالےکب تک مجھے لاکر دیتا رہے گا کہ طبیعت ان کھانے سے کراہت

کرتی ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ دس ناختوں کی محنت سے کمائی ہوئی طیب چیز لا کر دیا کرے جسے ہم کھایا کریں۔''

یہ سن کر آپ محنت مزدوری کے ارادہ سے سیالکوٹ کی طرف عازم ہوئے۔ وہاں نئے قلعہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور وہاں کھدائی کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ آپ بھی ان مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ وہاں ایک ذرعہ زمین مربع کھدائی کی مزدوری ایک تنکہ ملتی تھی۔ مگر کھدائی بہت ہی مشکل تھی۔ عام طور پر مزدور دو یا تین ذرعہ سے بڑھ نہیں پاتے تھے۔

حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ نے پہلے ہی روز اپنی قوتِ باطنی سے اور قوتِ بازو سے ستر ذرعہ زمین کی کھدائی کر ڈالی۔ یہ دیکھ کر منتظم حضرات حیران ہو گئے اور انہوں نے آپ کو ستر تنکے دیئے جن میں سے آپ نے صرف چار ہی اپنے پاس رکھے اور باقی واپس دے دئے۔اور فرمایا کہ مجھ انہی کی ضرورت ہے۔



آپ کی ایک کرامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب میں شدید ترین قحط پڑا جس کی وجہ بارش کا نہ ہونا تھا۔ عوام و خواص بڑی تعداد میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارانِ رحمت کی دعا کرنے کی استدعا کی۔ آپ نے جب دعا فرمائی تو اللہ تعالی کے فضل وکرم سے خوب خوب بارش ہوئی اور قحط کی صورت حال یکسر ختم ہو گئی۔ اگرچہ یہ ایک واقعہ ہی تھا۔ مگر آپ کی اس کرمت کی دور دور تک دھوم مچ گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں

حاضر ہونے لگی۔



ایک اور بھی کرامت آپ کی بہت سی مشہور ہے جو کہ راجوری کے راجہ کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے۔اس دور میں لوگ اپنے خاندانی اور معاشرتی دستور کے مطابق اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا کرتے تھے۔مگر جب راجہ کی بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی تھی تو آپ نے کہلا بھیجا کہ اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اس کو ہرگز نہ مارنا بلکہ اچھی طرح پرورش کرنا کیونکہ اس کے بطن سے بادشاہ جنم لیں گے۔

اس ضمن میں جناب پروفیسر کنجاہی صاحب فرماتے ہیں کہ راجوری کے راجہ کی بیٹی کو شاہ جہاں نامہ کے مصنف نے ''دختر زمیندار'' لکھا ہے اور اس طرف اشارہ کیا تھا کہ شاہ جہاں اور دارا شکوہ کا حق نمک ادا کرتے ہوئے ایسا کیا گیا۔کیوں کہ اہل دربار مزاج شناس شاہ ہوا کرتے تھے اور اورنگ زیب کے بارے میں چونکہ باپ بیٹا دونوں ہی تقریباً ایک سے جذبات رکھتے تھے اس لئے ملازمانِ بارگاہ شہنشاہی اس مزاج کو ذہن میں رکھتے ہوئے الفاظ کا استعمال کیا کرتے تھے۔طبقات پر مبنی اور گرد بندیوں کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے والے معاشرہ میں تیسرے درجہ کے شاہزادہ کے بارے میں جس کے جانشین ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا اور اس کی ایک ایسی بیوی کے بارے میں جو بیگانوں میں سے تھی اور جس کا باپ شاہ جہاں کے درباریوں میں سے نہیں تھا اور جس نے اپنی بیٹی علاقائی روایت کے مطابق خوشنودی حاصل کرنے یا اظہار وفاداری کے لئے

نذر کی تھی اس کا ردیہ ناممکن نہیں تھا۔

لیکن شاہ دولہؒ صاحب سے دونوں کے تعلق کے باعث یہاں تفصیل میں جانا اور اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب بائی کسی زمیندار کی بیٹی نہ تھی بلکہ وہ ایک اہم ریاست کے راجہ کی دختر تھی۔اس وضاحت کی ضرورت اس لئے بھی مناسب ہے کہ اب وہ ریاست ہمارے لئے ایک طرح سے مسدود ہو چکی ہے اور آزاد کشمیر کا حصہ نہیں ہے۔اس لئے بیشتر کو اس کے حالات اور اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوگا۔

ریاست راجوری جغرافیائی لحاظ سے اس راہ پر واقع ہے جس پر شمال کی جانب سے کبھی لوگ سیالکوٹ آتے تھے اور مشہور چینی سیاح ہیون سانگ اسی راجوری میں سے گزر کر پنجاب میں سیالکوٹ کی راہ آیا تھا۔ظاہر ہے کہ کشمیر میں سے ہوتا ہوا اور اسی لئے مسلمانوں کے عہد اقتدار میں کشمیر جانے کے راستوں ہی سے ایک راستہ راجوری والا تھا یہ علاقہ منورتوی اور اس کے پیر پنجال سے نکل کر آملنے والے معاونوں کی وادی ہے۔اسی کو تاریخوں میں راجاپوری لکھا گیا ہے۔

اس کے شمال کی جانب پیر پنجال پہاڑ ہے جو اسے کشمیر سے جدا کرتا ہے۔جنوب کی جانب بھنبھر ہے جو آزاد کشمیر کا حصہ ہے اور کبھی کشمیر جانے کے لئے باب اول کا کام دیتا تھا۔مشرق کی جانب چناب بہتا ہے تو مغرب کی جانب پونچھ اور کوٹلی کا علاقہ ہے۔راجاپوری کی جگہ اسے راجاوری بھی کہا گیا ہے جس سے راجوری بن گیا۔جہانگیر نے اسے راجور لکھا ہے۔اس دور میں دستور تھا کہ معاون

راجا اظہار وفا کے طور پر اپنی ایک بیٹی مہاراج کی نذر کیا کرتے تھے چنانچہ اسی قسم کی پیروی میں سُندر سینھ نے اپنی بیٹی زین العابدین (شادی خاں) کے ہاں بھیج دی تھی۔ جو اپنے بھائی علی شاہ کو بے دخل کر کے کشمیر کا فرماں روا ہو گیا تھا۔

یہ پندرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی ربع کی بات ہے۔ ازاں بعد ہر چند ریاست مقامی راجاؤں ہی کے پاس رہی لیکن قبول اسلام کر لینے کے باعث ان راجاؤں کے نام اسلامی رکھے جانے لگے تھے۔ اگر چہ مقامی نام بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اسی لئے بعض نے نواب بائی کے باپ کا نام غیر اسلامی یعنی مقامی لکھا ہے اور بعض نے اسلامی۔ ایک روایت کے مطابق صاحب سینھ اور اس کے بیٹے نیل سینھ نے غوریوں کے عہد میں قبول اسلام کیا تھا (تاثر الامراء جلد سوم (۴۳) میں لکھا ہے کہ مرزا حیدر گورگانی نے جو بابری خاندان سے تھا دور ہمایونی میں کشمیر کو فتح کیا تھا کہ وہاں کوئی مستقل حکمران نہیں تھا۔ دس سال تک فرماں روائی کے بعد وہ قتل ہوا۔

پھر قرا خاں نے جو اس کا عم زاد تھا اکبر کے عہد میں (۵ سال جلوس) اسے تسخیر کیا۔ لیکن راجوری کے حاکم غازی خاں سے شکست کھائی۔) اور اس کا نام شیر افگن خاں اور نور الدین خاں رکھا گیا تھا اور انہوں نے ہی راجوری کو فتح کیا تھا۔ لیکن جہانگیر نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں یہاں کا راجا مسلمان ہوا تھا۔ حقیقت جو بھی ہو مغلوں کے دور میں بعہد اکبر اس ریاست کا اور یہاں کے راجاؤں کا ذکر آتا ہے۔ سرمست خاں جسے بعض نے مست خاں لکھا ہے راجوری کا

پہلا راجہ تھا جس نے مغلوں کا فتح کشمیر کے سلسلہ میں ساتھ دیا۔ چنانچہ فتح کے بعد جلال الدین اکبر نے اسے خلعت عطا کی اور پنج ہزاری مالیت کی جاگیر دی۔ اور یہ جاننے پر کہ یہاں کے راجا مسلمان ہوتے ہوئے ہندوؤں والا لقب اختیار کئے ہوئے ہے اس لقب کو نواب میں تبدیل کرنے کو کہا گیا۔

لیکن اس کے نامانوس ہونے کے باعث راجا نے معذرت کی جسے قبول کرلیا گیا اور ساتھ ہی حکم کر دیا گیا کہ یہاں کے حکمران خاندان کے سب لوگوں کو مرزا کہہ کر خطاب کیا جائے۔ سرمست خاں کے بعد چتر سینھ (تاج الدین خاں) عہد جہانگیری میں ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں جہانگیر کئی بار راجوری گیا بلکہ راجہ کو کشمیر کی حفاظت کیلئے چوکیاں قائم کرنے کو کہا گیا۔ ۱۶۴۴ء میں جب شاہ جہاں راستہ راوری کشمیر گیا تو اورنگ زیب بھی ساتھ تھا۔ تجدید وفا کرتے ہوئے نذر کی ہو گی اور اسی کو اورنگ زیب سے منسلک کر دیا گیا۔ تاج الدین خاں کے بعد حیات اللہ خاں تخت نشین ہوا۔ لیکن صرف دو سال کے لئے۔

اس کے بعد عنایت اللہ نے زمام سنبھالی اور دارا شکوہ نے جسے پنجاب کا صوبہ ملا تھا۔ جنگ تخت نشینی کے دنوں میں اسے خط لکھا کہ اس سلسلہ میں اس کی مدد کرے لیکن اورنگ زیب کے ساتھ اسی تعلق کی بنا پر عنایت اللہ نے ایسا کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ سطور بالا سے اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ نواب بائی کسی عام زمیندا کی بیٹی نہیں تھی بلکہ ایک ریاست کے

مسلمان حکمران کی لخت جگر تھی۔اور اسی کے بطن سے پہلے دو بیٹے پیدا ہوئے۔جب کہ دلرس بانو کے بطن سے دوسرے بیٹے محمد معظم کی پیدائش کے دس سال بعد کہیں جا کر بیٹا ہوا۔

اس لئے اگر کرامت نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شاہ دولہؒ صاحب کی برکت دعا سے تھا تو ناقابل یقین نہیں ہے کہ ایک دور افتادہ علاقہ کی عورت کے لئے شاہی محل میں جڑ پکڑنے کے لئے نرینہ اولاد ہی واحد ذریعہ ہوسکتی تھی اور اگر اس نے کبھی خود آ کر یا کسی کے ذریعے آپ سے طلب فیض کیا ہو تو تعجب کی بات نہیں ہے۔بادشاہ کا اس کی میت کو دفن کے لئے گجرات بھیجنا بھی شاہ دولہؒ صاحب سے اسی تعلق کی بنا پر ہوگا جس کے لئے نواب بائی نے اسی طرح وصیت کی ہوگی۔جس طرح خود اورنگ زیب نے اپنے دفن کئے جانے کے بارے میں وصیت کر رکھی تھی۔اگر ایسی کوئی پابندی نہ ہوتی تو اورنگ زیب جس نے اسے ان ایام میں نواب بائی کے بطن سے پیدا ہونے والے پہلے بیٹے کی بغاوت اور پھر دوسرے بیٹے کی سرکشی کے باعث دردِ دل سے اٹھا دیا ہوا تھا اسے دہلی ہی میں کہیں سپرد خاک کر دیتا۔

لیکن یہ جو ولیم اِرون Later Moghuls میں لکھا ہے کہ نواب بائی کے باپ کا نام راجا راجو تھا اور جسے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں بھی نقل کیا گیا ہے، تحقیق طلب ہے کیونکہ راجوری کے راجاؤں کے سلسلہ میں یہ نام نہیں ملتا۔میرا ذاتی خیال ہے کہ کسی ابتدائی نسخہ میں راجہ راجور لکھا ہوا ہوگا جس کی ''ر'' نقل کرتے وقت کسی کاتب سے رہ گئی ہوگی اور بعد میں ''راجہ راجو'' ہی نام چل پڑا ہو

گا۔ کتابت کی اس قسم کی غلطیاں خارج از امکان نہیں ہوتیں کی جگہ سید بالکھا گیا ہے اور پور فنڈل کو نور فنڈل' نواب بائی کو، ہچسن نے خلاصتہ التواریخ (اردو ترجمہ) میں شاہ دولہؒ صاحب کے مرشد کا نام جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے سیدنا History of The Hill States میں راج بائی لکھا ہے جو ممکن ہے اس کا علاقائی نام ہو لیکن چونکہ اکبر نے ہندوؤں والے لقب کو نواب میں بدلنے کو کہا تھا اس لئے ممکن ہے نواب زادی کے طور پر مغلیہ محل میں اس کو نواب بائی کہنے لگے ہوں اور اسلامی نام رحمت النساء رکھا گیا ہو۔ ہچسن کا کہنا ہے کہ نواب بائی اسی راجپوت خاندان سے تھی جس کے اجداد میں سے ایک کو تیمور نے شکست دے کر مسلمان ہو جانے کو کہا تھا۔



حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کی کرامات میں ایک کرامت نالہ ڈیک پر مضبوط پل قائم کرنا بھی زبان زدِ عام ہے۔ آپ نے دریائے چناب پر جو پل بنوایا وہ اپنی مثال آپ تھا اور ایسا پل پھر کبھی نہ بن پایا۔ جب شاہ جہاں نے پل بنوانا چاہا تو اس کے آدمیوں کو مشکل پیش آئی۔ آخر آپ کو کہا گیا تو آپ نے اس کا بیڑا اٹھایا۔

ابھی آپ نے وہاں پر کام شروع ہی کروایا تھا کہ ایک ہندو سادھو آڑے آیا اور اس نے آپ کے کام میں روڑے اٹکانا شروع کر دیئے۔ آپ نے پہلے پہل تو اس کو سمجھایا مگر جب وہ نہ مانا تو آپ نے قوتِ باطنی سے اس کو چونے اور

گارے میں گردن تک دھنسا دیا۔ اس کے بعد وہ آپ کا سچا عقیدت مند بن گیا اور پھر آپ ہی کے ساتھ رہا۔



حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ کی ایک کرامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ خونخوار سے خونخوار جانور بھی آپ کے آگے دم دبا دیا کرتے تھے۔ آپ کے ارد گرد شیر ہاتھی بکریاں ہرن اور چرند پرند موجود رہتے تھے اور ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔

یہ بھی روایات میں ملتا ہے کہ آپ کے پاس جو جانور ہوتے تھے اکثر اوقات آپ ان کے سروں پر موتیوں سے مرصع ٹوپیاں پہنا دیا کرتیت تھے۔ اس طرح وہ جانور خوبصورت بھی دکھائی دیتے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کی پہچان بھی باآسان ہو جایا کرتی تھی کہ یہ جانور کس ہستی کے ہیں۔ روایت ہے کہ اس طرح ٹوپی پہنے ہوئے ایک ہرن جہانگیر بادشاہ نے شاہدرہ کے قریب دیکھا اور حضرت شاہ دولہسرکار سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔

آپ کی تمام تر کرامات کو پڑھ کر یا سن کر جو خیال اس فقیر کے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت شاہ دولہ سرکار علیہ الرحمتہ اپنے عقیدت مندوں کو بھیک مانگ کر کھانے والا نہیں بنانا چاہتے تھے۔ آپ کی ایک کرامت کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ دفن شدہ خزانے باآسانی ڈھونڈھ لیا کرتے تھے۔ اسی لئے ہمیں کسی جگہ یہ نہیں ملتا کہ آپ نے کسی کے آگے دست سوال دراز کیا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آپ نے بہت سی عمدہ عمارتیں، مساجداور کئی ایک پل بھی تعمیر کروائے تھے۔اس فقیر کا خیال یہ ہے کہ آپ تعمیرات میں عام طور پر اپنے درویشوں سے کام کرواتے ہوں گے۔اسی طرح ان کو معاش بھی ملتا تھا اور وہ لوگ روحانی مدارج بھی طے کرتے ہوں گے۔اگرچہ ہمیں اسناد کے ساتھ کچھ معلوم نہیں ہو پاتا مگر ہمارے راغالب خیال یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یقین کرنا پڑے گا کہ اگرچہ آپ نے علوم وفنون کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔مگر آپ یقیناً ایک ماہرِ تعمرات تھے۔ اسی طرح آپ ایک بہترین منتظم بھی تھے کہ لاتعداد لوگوں کو کام پر لگا کر ان سے کام بھی کرواتے اوران کی مزدوری بھی عنایت کرتے۔افسوس کہ ہمیں تاریخ کے اوراق سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔واللہ عالم بالصواب۔